معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل

نعیم صدیقی

★

مکتبۂ چراغِ راہ

لاہور کراچی

معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل

نعیم صدیقی

مکتبہ چراغِ راہ

کراچی ——— لاہور

(جملہ حقوق محفوظ برائے مصنف)

طبع اول ۔۔۔۔۔۔ مئی سنہ ۱۹۵۱ء

تعداد اشاعت ۔۔۔۔۔۔ ۱۱۰۰

قیمت: تین روپے چار آنے۔

مکتبۂ چراغِ راہ

ہیڈ آفس:- ۹- لوٹیا بلڈنگ - آرام باغ روڈ - کراچی ۱ء

برانچ آفس:- ۱۱- فردوسی سٹریٹ - پونچھ روڈ - لاہور

خالد احمد صدیقی پرنٹر پبلشر نے انشا پریس لاہور میں چھپوا کر مکتبۂ چراغِ راہ
پونچھ روڈ لاہور سے شائع کیا

فہرست مضامین

مُقدّمة

اسلام پوری زندگی کا ضابطہ و نظام لے کے آیا ہے ---

اس حقیقت کو ایک مدت سے علماء و مفکرین واضح کرتے چلے آ رہے ہیں، لیکن مذہب و سیاست اور معاش و معاد کے علیحدہ ہونے کا تصور ذہنوں میں اتنی گہری جڑیں چھوڑ چکا ہے کہ کھرچ کھرچ کر بھی اسے الگ کرنا چاہیں تو وہ پوری طرح الگ نہیں ہوتا، بلکہ اس کی جڑوں سے نت نئی کونپلیں پھوٹ آتی ہیں۔ یہ ایک عجیب صورتِ حالات ہے کہ نہایت درجہ معقول لوگ پورے وزنِ استدلال کے ساتھ ایک طرف اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات اور جامع نظام کی حیثیت سے خود ہی پیش بھی کرتے ہیں اور دوسری طرف غیر اسلامی اصولوں کو اس میں لا کر فٹ بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے ہی دعوے کی خود تردید کر دیتے ہیں۔ ایک طرف وہ یہ مانتے ہیں کہ ہاں اسلام نے اپنے دورِ عروج میں ہر دوسرے مسئلے کی طرح معاشی مسئلے کو بھی بہترین طور پر حل کیا تھا اور دوسری طرف خود ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں معاشی مسئلے کا حل فلاں نظام اور فلسفے سے مدد لئے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس تضاد بیانی کے درمیان وہ گویا یہ اعلان کرتے ہیں کہ اسلام ہر دور

کے لئے کارآمد ضابطہ نہیں ہے، بلکہ مرورِ زمانہ اس کے اصولوں کی قدر وقیمت کو کم اور کم سے کم تر کرتا چلا جا رہا ہے۔ پھر جب وہ اسلام کے ساتھ دوسرے نظاموں سے مستعار لے کر کچھ اصولوں اور ضابطوں کا جوڑ لگانا ضروری قرار دیتے ہیں تو وہ درحقیقت غیر شعوری طور پر یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام ایک جامع نظام اور مکمل دین نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی تکمیل کے لئے دوسرے دینوں اور نظاموں کے آگے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہے۔ یہی نہیں، بلکہ بالعموم دین وسیاست کو ایک قرار دینے والے حضرات کھلم کھلا یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ عبادات واخلاق اسلام سے لیکر اُن کا جوڑ موجودہ دَور کے اشتراکی نظامِ معیشت سے لگا دینا ہی بہترین طریقِ کار ہے، ورنہ اس کے بغیر ہماری مشکلات حل نہیں ہو سکتیں۔ اس قسم کے پس منظر میں دین و دنیا کی تفریق کا خطرناک نظریہ پناہ گزیں ہے۔

اسلامی نظام کے تعطّل کے اثرات

ایک ایسے نظامِ زندگی کے متعلق جو نگاہوں کے سامنے کام نہ کر رہا ہو، ایسی غلط فہمیوں، تضاد فکریوں اور ذہنی اُلجھنوں کا پیدا ہونا قدرتی امر ہے۔ ہماری اصل مشکل یہی ہے کہ ہماری نگاہوں کے سامنے

چاروں طرف صرف غیر اسلامی نظام ہی چل رہے ہیں اور اسلامی نظام کی حرکت کا نظارہ اگر ہم دیکھ سکتے ہیں تو صرف تاریخ کے اوراق میں دیکھ سکتے ہیں۔ ایک چلتے نظام کے طبعی تقاضوں کے تحت اس کے مختلف شعبوں کی سائنس مسلسل ارتقا کرتی رہتی ہے اور اس کی تشریح و توضیح کا فن وقت کے ذہن عامہ کے مطالبات کو سمجھ کر اُس نظام کے اُصولوں کو نئی نئی اصطلاحات اور نئے نئے انداز بیان کے ساتھ پیش کرتا رہتا ہے۔ لیکن اسلام بحیثیت ایک جامع نظام کے جب سے ہماری زندگیوں سے برطرف ہوا ہے، قدرتی طور پر اس کے مختلف شعبوں کی سائنس کا ارتقا بھی رک گیا ہے، اس کے اصولوں کو پھر کبھی "حالاتِ حاضرہ" پر منطبق کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، اس کی وضاحت کے لئے نئی اصطلاحات اور نئے اسالیب بیان مہیّا نہیں ہوتے، ——— اور آج کا ذہن جب پیچھے پلٹ کر اسلامی نظام کا مطالعہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے قدیم علمی ذخائر میں ان مسائل کے متعلق علمی بحثیں سرے سے ملتی ہی نہیں جن سے وہ آج دوچار ہے، پھر اس کے سامنے جو حقائق آتے ہیں وہ بھی ایسی ترتیب، ایسی اصطلاحات اور ایسے

اسالیب کے ساتھ آتے ہیں جن سے آج کا ذوق بہت دور جا چکا ہے۔ بدیں وجہ وہ پورا اطمینان حاصل نہیں کر سکتا اور اس کی بے اطمینانی اس کے فکر میں انتشار، اضطراب اور تضاد پیدا کر دیتی ہے۔

اسلامی نظام زندگی کے معطل رہنے کی وجہ سے ایک دوسری مصیبت جو پیدا ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ آہستہ آہستہ دین کے علمبردار اور دنیا کے کارپرداز دو علیحدہ علیحدہ طبقوں میں بٹ گئے ہیں، اور اس علیحدگی کو انگریزی حکومت نے ایک انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ نظامِ سیاست و معیشت کو چونکہ سالہا سال سے غیر اسلامی خطوط پر چلایا جا رہا ہے، اس وجہ سے اس کے ڈرائیوروں اور کارپردازوں کو اپنے کام میں سرے سے اسلامی علوم کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ پس کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اسلامی علوم کو ارتقا دینے میں محنتیں صرف کرتے!۔ اِدھر دوسری طرف دین کے علمبرداروں کا تعلق چونکہ سیاست و معیشت کے مسائل سے عملاً منقطع ہو گیا تھا اور ان کا دائرہ عمل "مسجد و محراب و منبر" کی حدود میں محدود ہو گیا تھا، لہٰذا انہوں نے بھی اگر دین کا علم حاصل کیا ہے تو اس نقطۂ نظر سے نہیں کہ ان کو اسلامی نظامِ سیاست و معیشت کے چلانے کی صلاحیتیں پیدا کرنی ہیں یا اس مقصد کے

لئے انہیں مزید کارکنوں کو تربیت دینا ہے، بلکہ "مدرسہ" کی ساری ہما ہمی بیشتر جن مقاصد کے لئے قائم چلی آئی ہے، وہ "امامت" "مدرسی" اور "درس و افتاء" سے زاید کچھ نہ تھے ـــــ الا ماشاء اللہ! اس حالت میں قدرتی طور پر علمِ دین کا اصل میدان، "باب المیاہ"، "کتاب الطہارت" اور "کتاب النکاح" وغیرہ کے مسائل تھے۔ علم دین کے مقاصد کی اس محدودیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ دین میں نہ موجودہ دور کے سیاسی و معاشی مسائل کا ماہرانہ فہم پیدا ہو سکا اور نہ وہ اسلام کے علومِ سیاسی و معاشی کو آپ ٹو ڈیٹ کرنے کے لئے کوئی کارنامہ دکھا سکے۔

علمبردارانِ دین سیاست و تمدن کے مسائل سے مقاطعہ کرنے پر مجبور رہے اور سیاست و تمدّن کے کارپرداز دین کی رہنمائی سے بے نیاز تھے۔ بلکہ دونوں طبقات کے درمیان باہمی منافرت کارفرما چلی آئی ہے حد یہ کہ دونوں کے ذوق، رجحانات، عادات، آداب، زبان اور طرزِ گفتگو میں اتنا بُعد ہے کہ اسلام کے لئے دونوں کا مل کر کام کرنا مشکل ہو رہا ہے۔

یہ ایک عجیب صورتِ حالات ہے کہ جو لوگ سیاست و تمدّن کی

گاڑی کے ماہر ڈرائیور ہیں وہ اس شاہراہ سے واقف نہیں جس کی طرف اسلام نے دعوت دی ہے، اور دوسری طرف وہ لوگ جو اس شاہراہ کے پیچ وخم سے واقف ہیں اُن کو گاڑی کی ڈرائیونگ سے کوئی مَس نہیں، اور پھر ستم یہ کہ وہ اِن سے کچھ سیکھنے پر تیار نہیں ہیں اور یہ اُن سے کچھ حاصل کرنے کو توہین سمجھتے ہیں۔ ڈرائیوروں کو راہ دانوں سے کد ہے اور راہ دانوں کو ڈرائیوروں سے نفرت ہے۔

ان حالات میں اسلام کے متعلق جتنی بھی غلط فہمیاں اور اُلجھنیں پیدا ہوں، کم ہیں۔ اور ہر وہ شخص جو ان حالات میں اسلام کا نام زبان پہ لائے، ان غلط فہمیوں کو صاف کرنے کے لئے مسلسل محنت کرنا اُس کا بنیادی فرض قرار پاتا ہے۔ جماعت اسلامی کے حلقہ سے جو لوگ وابستہ ہو رہے ہیں وہ اپنی اس ذمہ داری کو سمجھ کے آرہے ہیں۔ اور ان غلط فہمیوں کو صاف کرنے کے لئے وہ اسلام کو جدید اصطلاحات اور اسالیب کے ساتھ پیش کرنے میں مصروف ہیں، نیز وہ اسلامی سیاست ومعیشت کے اصولوں کو دورِ حاضر کے مسائل پر منطبق کرنے کے لئے بساط بھر سعی کر رہے ہیں۔ یہ کام دو چار سال کا نہیں، بلکہ اس میں ہیں

اور ہماری آئندہ نسلوں کو عمریں کھپانی پڑیں گی۔

درحقیقت ان ساری الجھنوں سے ہمارے خواص اور عوام کی نجات تو اسی روز ہو سکے گی، جس روز "اسلامی نظام" بطور ایک امر واقعہ کے آنکھوں کے سامنے قائم ہو جائیگا اور اس کے تحت مختلف مسائل ایک خاص نہج سے حل ہوتے دکھائی دیں گے ـــــــ کیونکہ "ایمان بالغیب" لانا تو صرف اعلیٰ درجے کے ذہین لوگوں کا کام ہوتا ہے، اوسط درجے کا ذہن "ایمان بالشہود" کی منزل سے آگے نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم علمی مساعی سے زیادہ نظامِ اسلامی کے عملی قیام پر توجہ صرف کر رہے ہیں۔ تاہم چونکہ اسلامی نظام کے قیام کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے عوام اس کے اصولوں اور اس کے طریقِ کار پر پوری طرح مطمئن ہو جائیں، اس لئے ایک حد تک علمی حیثیت سے اسلام کی توضیح "باندازِ نو" کرنا ناگزیر ہے۔

جنگِ مثلث

موجودہ صورتِ حالات کی یہ نزاکت ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی تین مختلف طاقتیں اس کو اپنے اقتدار میں لینے کے لئے

برسرِ کشمکش ہو چکی ہیں:- ایک طاقت تو سرمایہ دارانہ جمہوریّت کے دین کی ہے، دوسری کمیونزم کے دین کی طاقت اور تیسری اسلام کے دین کی طاقت ہے۔ یہ تینوں طاقتیں عوام کو اپنے ساتھ لینے کے لئے تگ و دو کر رہی ہیں۔ قریب قریب یہ ایک "حالتِ جنگ" ہے جس میں ہم مبتلا ہیں اور پاکستان کا کوئی شہری ایسا نہیں جو اس جنگِ مثلّث میں کسی نہ کسی پہلو سے شریک نہ ہو۔ یہ نازک لمحہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ پاکستان کا ہر متنفّس سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے کہ اس کو کس ایک قوت کے ساتھ ہو کر کن دو قوتوں کے خلاف معرکہ آرا ہونا ہے۔

یہ ہم جانتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ جمہوریّت کی طاقت جو پہلے سے جڑیں چھوڑے ہوئے ہے، وہ ہمارے نوجوانوں اور ہمارے محنت پیشہ عوام کا اعتقادی و ذہنی تعاون کبھی بھی حاصل نہیں کر سکتی اور وہ اگر قائم ہے یا قائم رہ سکتی ہے تو صرف اس مفاد پرست طبقۂ رؤسا کے بل پر جو روپے، عہدوں، جاگیروں اور سیاسی سازشوں کے ذریعے ملک پر مسلّط ہے۔ باقی دو طاقتیں ایسی رہ جاتی ہیں، جن کے گرد مستقبل پر اثر انداز ہونے والے عناصر سمٹ رہے ہیں اور جن کے بارے میں

ذہین و فعال شہریوں کی ایک بڑی تعداد آخری فیصلے پر پہنچنے سے پہلے ایک تذبذب و تامّل کی حالت میں مبتلا ہے۔ اس بہت بڑی تعداد میں بیشتر ایسے لوگ ہیں جو اسلام سے اتنی عقیدت تو رکھتے ہیں کہ اسے خیر باد کہہ کر دوسری جانب کی مخالفِ اسلام قوت کے سامنے اپنی خدمات پیش کرنے پر تیار نہیں ہیں، لیکن دوسری طرف ان بچاروں کو ایسی رہنمائی آج تک نہیں بہم پہنچ سکی کہ یہ اسلام کے موجودہ دورِ تمدّن میں ایک کارفرما طاقت بن کر کام کرنے کا کوئی تصوّر ذہن میں قائم کر سکیں۔ بلکہ ان کے دلوں میں یہ کھٹک دبی ہوئی موجود ہے کہ شاید اسلام اس دَور میں چل نہ سکے گا۔ پھر یہ آج کے معاشی مسائل کے بارے میں اسلامی اصولوں کے تحت کوئی عملی حل اپنی نگاہوں کے سامنے نہیں رکھتے، بلکہ ان کے دلوں میں بے شمار سوالات اُبھرتے ہیں اور نمائندگانِ اسلام کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس عقیدت پر ضرب لگاتے ہیں جو اسلام کے لئے کچھ دلوں میں اب تک باقی ہے۔

جماعت اسلامی کے لٹریچر میں ایسے ذہین اور فعال عناصر کے لئے ایک گونہ سامانِ تسکین موجود ہے، اور اس مقصد کے لئے مزید کام

مسلسل ہو رہا ہے۔ انہی عناصر کے اطمینان کے لئے "معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل" کی تقریر مرتب کی گئی تھی اور انہی عناصر کے لئے اسے تکمیل دے کر ایک کتاب کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

چار مدارسِ فکر

اس مقدمہ میں راقم الحروف اپنا فکری موقف واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہے لیکن اس موقف کی وضاحت بغیر اس کے نہ ہو گی کہ ان مدارسِ فکر کو نہ سمجھ لیا جائے جو ہمارے ہاں معاشی مسائل کے بارے میں پائے جاتے ہیں یہ مدارسِ فکر چار ہیں :-

(۱) ایک مکتبِ فکر تو وہ ہے جو کھلم کھلا کمیونزم کا علمبردار ہے اور ایک مستقل پارٹی اس مکتبِ فکر کے تحت ایک انقلابی تحریک کو لے کے چل رہی ہے۔ اس مکتبِ فکر کو نہ صرف یہ کہ اسلام سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ صریحاً اسلام کا اور اس کی قدروں کا مخالف ہے۔ یہ چیز بجائے خود ایک مضحکہ ضرور ہے کہ اس مکتبِ فکر کے مومنین بیشتر مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہوتے ہیں، مسلمانوں کے سے ناموں سے موسوم ہیں، مسلمانوں کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلقات رکھتے ہیں، مردم شماری کے رجسٹروں میں اور دوسرے سرکاری کاغذات میں مسلمانوں کے مذہبی گروہ ہی سے

منسوب کئے جاتے ہیں مسلمانوں کے قومی حقوق میں برابر کے حصّہ دار ہیں۔ اور مسلمانوں کی سی کچھ رسوم وعادات میں مبتلا ہیں۔ لیکن یہ اسلام کے دین سے عقیدۃً بالکل منقطع ہو کر کمیونزم کو اپنے لئے ایک دین ہی کی حیثیت سے قبول کر چکے ہیں۔ ایک صحیح مسلمان جتنے حقوق دین اسلام کی طرف سے اپنے اوپر واجب سمجھتا ہے، یہ حضرات انہی حقوق کو کمیونزم کی طرف سے اپنے اوپر واجب سمجھتے ہیں۔

(۲) مذکورہ بالا مکتبِ فکر سے کئی گنا زیادہ خطرناک، مہلک اور مفسدہ انگیز مکتبِ فکر وہ ہے جس کے متوسّلین اسلام اور کمیونزم کو جمع کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے دل اندر سے فریفتہ تو ہیں کمیونزم پر، لیکن یہ اپنے آپ کو اسلام کا خادم بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ ان کی یہ دورنگی اپنے مختلف تناسب کی وجہ سے کئی مختلف شکلوں میں منظر آرہا ہے، اور اس طرح اس مکتبِ فکر کے متوسلین کی حسبِ ذیل مختلف اقسام پیدا ہو گئی ہیں:-

(أ) کچھ وہ لوگ ہیں جو ایمان تو کمیونزم ہی پر رکھتے ہیں، لیکن عوام پر اثر ڈالنے کے لئے کمیونزم کے ہر اصول کو اسلام سے ثابت کرتے ہیں اور اسلام ہی کی اصطلاحات میں بیان کرتے ہیں۔

(ب) کچھ وہ لوگ ہیں جو یہ دعوت دیتے ہیں کہ عبادات اور اخلاق کا سبق تو اسلام سے لینا چاہتے لیکن سیاسیات میں جمہوریت اور معاشیات میں اشتراکیت کے اصولوں کو اختیار کئے بغیر موجودہ دَور میں اسلام کا قائم رہنا ممکن نہیں ہے، لہٰذا "اجتہاد" سے کام لینا چاہتے اور اجتہاد کے معنی ان حضرات کے نزدیک غیر اسلامی نظام کو تھوڑے بہت تصرفات کے ساتھ قبول کر لینے کے ہیں۔

(ج) ان میں سے کچھ وہ ہیں جو اس طرز پر سوچتے ہیں کہ کمیونزم تو آ کے ہی رہے گا اور وہ موجودہ نظام کو بہرحال تہ و بالا کریگا ہی، تو پھر کیوں نہ اس کے آنے سے پہلے ہم خود ہی اس کی مطلوبہ تبدیلیاں پیدا کر دیں، اس طرح اس بات کی گنجائش تو رہے گی کہ نماز روزہ کر کے اسلام سے تعلق قائم رکھا جا سکے۔

(د) ان میں ایک طبقہ ایسا بھی نمودار ہو رہا ہے جو اس طرز فکر پر سوچتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام بھی کفر ہے اور کمیونزم بھی کفر ہے، پس سرمایہ داری کے اشدّ کفر کو شکست دینے کے لئے کمیونزم کے نسبتہً بہتر کفر (ان حضرات کا یہ اپنا اندازہ ہے) کے ساتھ تعاون کر لینے میں اسلام

کا فائدہ ہے چنانچہ یہ دو بلاؤں میں سے ایک بلا کو انتخاب کر کے اس کے ساتھ شریک کار ہو رہا ہے۔

اس طرح کے مختلف عناصر بظاہر اسلام کی قصیدہ خوانیاں کرتے رہتے ہیں اور اپنی تحریروں اور تقریروں میں اسلام کے لئے بالعموم ضرورت سے زیادہ تعریفی الفاظ استعمال کیا کرتے ہیں، اور دوسری جانب یہ کمیونزم کے اصولوں اور اس کے طریق کار کے خلاف شدید سے شدید کلمات استعمال کرتے ہیں، لیکن ان کی اصلی بحث کا جو آخری خلاصہ حاصل کیا جا سکتا ہے وہ ہمیشہ اسلام کی نفی اور کمیونزم کے اثبات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اِن کا دعویٰ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ ہم تو اصل اسلام ہی چاہتے ہیں، لیکن یہ اسلام جس کے چرچے ہیں اور وہ اسلام جو کتابوں میں پایا جاتا ہے وہ اصلی اسلام نہیں ہے، یہ تو اسلام کی وہ شکل ہے جو سرمایہ دارانہ طرز فکر نے ڈھال دی ہے اور جسے رجعت پسند "مولویوں" نے پھیلا رکھا ہے۔ اصلی اسلام کا علم صرف ہمیں حاصل ہے:

مگر اس طرح کے لوگوں کے "اصلی اسلام" کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے اتنا کافی ہوگا کہ ان کی شخصی اور کاروباری زندگی پر ایک نگاہ

ڈال لی جاتے۔ ان کی عملی زندگیوں سے جب آپ ان کے اصلی اسلام کا جائزہ لینا چاہیں تو اس اصلی اسلام کے دائرے میں آپ کو عیاشی ملیگی، اوباشی پیا ملے گا، شراب کی مجلسیں ملیں گی، ناچ گانے کے آرٹ کی قدر شناسیاں ملیں گی، ناجائز الاٹمنٹیں ملیں گی، رشوت خواری ملے گی! ان کے اصلی اسلام میں عورتوں کا کمال بے پردگی سے ہوگا، ان کا اصلی اسلام تجارت کے عروج کے لئے سودی نظام کو لازم ٹھہرائے گا، ان کا اصلی اسلام ادب میں عشق و محبت کے عُریاں مناظر لے کے آتے گا، ان کا اصلی اسلام صحافت کے میدان میں جھوٹ اور بدزبانی کا طوفان بپا کرتا دکھائی دے گا، اِن کے جرائد میں ان کا اصلی اسلام گندے اور فحش اشتہارات کی اشاعت کو جائز قرار دیگا —— الغرض ان کے اصلی اسلام کے کمالات جب ان کی عملی زندگیوں میں آپ تلاش کر کر کے دیکھیں گے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کی قصیدہ خوانیاں کیا معنی رکھتی ہیں۔

اسلامی فکر کے فروغ اور اسلامی نظام کے قیام میں پاکستان کے اندر جو قوت سب سے زیادہ بری طرح حائل ہے وہ یہی دورنگی قوت ہے اس آدھے تیتر اور آدھے بٹیر نے نہ معلوم کتنے ہی ذہنوں کو اُلجھنوں

میں ڈال رکھا ہے اور کتنوں کی نگاہوں کو حقیقت شناسی سے محروم کر دیا ہے۔ یہ گروہ درحقیقت کمیونسٹ عساکر کے آگے آگے گوریلا وار لڑتا ہوا ان کے لئے راستہ صاف کر رہا ہے، اور اس کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اسلام اور کمیونزم کو گڈمڈ کر کے دونوں کے بارے میں ذہنی الجھنیں پیدا کر دے اور اسلام کی طرف عوام الناس کو یکسو نہ ہونے دے!

(۳) ان دونوں مدارس فکر کے بالمقابل وہ مدرسۂ فکر ہے جو پرانے جاگیردارانہ نظام کے آثار و روایات اور نئے صنعتی نظام کے درآمد کردہ مفسدات کو جُوں کا توں قائم رکھنے کے لئے سر توڑ کوشش کر رہا ہے، اور یہ کمیونزم اور اسلام دونوں کے مقابلے میں اپنے مورچے مضبوط کرنے میں مصروف ہے۔ ستم یہ کہ اس مدرسۂ فکر کے متوسلین نے بھی اپنے ہاں اسلام کا جھنڈا گاڑ رکھا ہے۔ یہ لوگ اقتدار پر قابض ہیں اور "قرار داد مقاصد" کو انہوں نے اپنا جنگی قلعہ بنا لیا ہے۔ پھر غضب یہ کہ انہوں نے اسلام کی اصطلاحات اور اسلام کی سی بولی مستعار لے لی ہے اور یہ بولی بول کر عوام کو مسحور کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کو اسلام کے خدّام کی صفِ اوّل میں شمار کر لیا جائے۔

لیکن یہاں بھی اگر الفاظ کے جادو سے اثر لئے بغیر ان کی عملی سرگرمیوں پر نگاہ ڈالی جاتے تو حقیقت حال بالکل سامنے آجاتی ہے

(۴) آخری مدرسۂ فکر اسلام کا مدرسۂ فکر ہے۔ اس کے مرکز سے جو لوگ وابستہ ہیں وہ نہ جاگیرداری و سرمایہ داری کے مفاسد کے رواداں ہیں اور نہ کمیونزم سے کوئی سمجھوتہ (Compromise) کرنا ان کے لئے ممکن ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس حقیقت پر قطعی ایمان رکھتے ہیں کہ اسلام —— پورے اسلام —— کی پیروی کرنا موجودہ دَور میں ان کے لئے اسی طرح فرض ہے جس طرح آج سے ہزارہا سال پہلے کے "مسلم" کے لئے فرض تھا۔ اور یہ اس پر بھی قطعی ایمان رکھتے ہیں کہ جدید سے جدید مسائل کا بہترین اور متوازن حل صرف اسلام ہی کے پاس ہے اور دوسرے بہتر سے بہتر حل اپنے ساتھ بے شمار مفاسد رکھتے ہیں۔

راقم الحروف کا تعلق اسی مدرسۂ فکر سے ہے۔

لیکن خود اس مدرسۂ فکر سے دو طرح کے لوگ وابستہ ہیں۔ ایک وہ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کے اصولوں پر جو معاشی نظام آج سے

سوا ہزار سال قبل قائم ہوا تھا، اسے آج ساری تفصیلات کے ساتھ شوشہ بہ شوشہ قائم کرنا ہوگا، چنانچہ ان حضرات کے نزدیک قرونِ اولیٰ کی فقہ اس قابل ہے کہ اسے جُوں کا توں اٹھا کر نافذ العمل کر دیا جائے۔ ان کے نزدیک کسی نئی علمی تحقیق اور کسی مزید ذہنی تیاری کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ان کے علم میں کوئی ایسا نیا مسئلہ ہے جو از سرِ نو اجتہادی غور و فکر کا متقاضی ہو۔

بخلاف اس کے دوسرا گروہ وہ ہے جو اگرچہ اسلام کے منصوص اصولوں میں یک سرِ مو کسی تحریف و تصرف کا قائل نہیں ہے، لیکن وہ یہ ضروری سمجھتا ہے کہ دورِ حاضر کے تمدنی تقاضوں کے پیشِ نظر جدید مسائل کو گہرے تدبر و تفقہ سے بالکل از سرِ نو حل کیا جائے اور اسلام کے ایک ایک اصول کو خلفاء راشدین اور ائمۂ فقہا و مجتہدین کے قائم کردہ علمی و عملی نظائر کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ پر منطبق کر کے ایک جامع معاشی نظام کی تفصیلات دوبارہ ترتیب دی جائیں۔ علومِ سیاست و معیشت کی از سرِ نو تدوین ہو، جس میں ترتیبِ مباحث، زبان، اصطلاحات اور استدلال کے وہ ترقی یافتہ طریقے اختیار کئے

جائیں جن کے بغیر اسلامی علوم سے موجودہ زمانے کے لوگوں کا اثر پذیر ہونا اور پورا پورا استفادہ کرنا ممکن نہیں ہے۔

درحقیقت یہی وہ گروہ ہے جو پاکستان میں اسلام کے احیاء اور اسلامی نظامِ معیشت کے اجرا و نفاذ کی مہم کو صحیح خطوط پر لے چل سکتا ہے، اور اسی کے لئے راقم الحروف کی ہمدردیاں — ہمدردیاں ہی نہیں، پورا پورا فکری و عملی تعاون — وقف ہیں!

ذہنی انتشار کی حالت

ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کی گوناگوں تعبیریں کی جارہی ہیں اور اس کی اصطلاحات کا حلیہ بگاڑا جارہا ہے۔ چنانچہ ایک عام ذہنی انتشار برپا ہے۔ اس ذہنی انتشار کو مخالفینِ اسلام اور زیادہ ہوا دینے میں مصروف ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہے کہ اگر عوام — خصوصاً نوجوانوں — کو وہ اپنے فکر و مسلک پر جمع نہ کرسکیں تو کم سے کم اسلام پر بھی جمع نہ ہونے دیں۔ ایں دریں احوال اشد ضرورت ہے کہ اسلامی نظامِ معیشت کو اس کی اصل صورت میں (اسلام کے ماٰخذ سے استدلال کرتے ہوئے) سائنٹفک طریق سے پیش کیا جائے اور عوام الناس کو اطمینان دلایا جائے کہ تمہارے سارے

مسائل کا حل خدا اور رسول کے "پرانے" اسلام میں موجود ہے اور اس کو نہ مسخ کرنے کی ضرورت ہے، نہ اس کے ساتھ کسی کفر کا پیوند لگانے کی حاجت ہے۔ یہ کام اس حد تک ہونا چاہیئے کہ اسلام کا نام لے کر غلط لوگوں کے لئے پاؤں پھیلانا ممکن نہ رہے۔ نیز اصل اسلام — پورے کے پورے اسلام کو عملاً نافذ کرنے کے لئے جس جذبۂ صادق کے بروئے کار آنے کی ضرورت ہے، اس کو پیدا کرنے کے لئے ذہین عناصر میں شعوری اطمینان پیدا کر دیا جائے۔

آئندہ صفحات میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے، اس کا مقصد یہی کچھ ہے، لیکن مجھے اپنی علمی کمزوریوں کے پیش نظر اعتراف ہے کہ اس مقصد کی خدمت کا حق ادا نہیں ہو سکا، بس اتنا فائدہ اس خدمت سے اگر ظاہر ہو کہ کچھ ذہنوں میں مسلم زاویۂ نظر کے ساتھ سوچنے کی اسپرٹ پیدا ہو جائے تو میں سمجھوں گا کہ محنت ٹھکانے لگی۔

کتاب کی ترتیب

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے درحقیقت اس طرح نہیں لکھی گئی کہ باقاعدہ مستقل تصنیف کا نقشہ سامنے رکھ کر ایک ترتیب کے ساتھ مباحث

مرتب کیے گئے ہوں، بلکہ یہ متفرق مضامین کا مجموعہ ہے جس کا مرکزی مضمون "معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل" ہے۔

گذشتہ سال میری ایک کتاب "کمیونزم یا اسلام؟" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی جو میرے ایک مقالے پر مشتمل تھی۔ یہ مقالہ اسلامیہ کالج لاہور کے سرمن میں پڑھا گیا تھا۔ بعد میں اسے کتابی شکل میں شائع کیا گیا، اور اس کے ساتھ "چراغِ راہ" میں شائع شدہ ایک مضمون شامل کر دیا گیا۔ میں اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ اس مقالے کی اشاعت بہت نتیجہ خیز ہوئی، چنانچہ دو تین نوجوانوں کے متعلق تو میں خود جانتا ہوں کہ اُن کی فکری دنیا از سرتاپا بدل گئی۔ اس پمفلٹ کا ایک ہزار کا ایڈیشن بہت جلد ختم ہو گیا اور پھر برابر مانگ آتی رہی۔ اب اس مقالے میں سے وہ حصہ الگ کر کے جس کی تفصیل "معاشی ناہمواریوں" میں شامل ہے، اس کتاب میں لے لیا گیا ہے۔

"معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل" کوئی مقالہ نہیں، بلکہ یہ ایک تقریر تھی جو اوّل اوّل میں نے جماعت اسلامی (پاکستان) کے سالانہ اجتماع منعقدہ ۶، ۷، ۸ مئی ۱۹۴۹ء (بیرون دہلی دروازہ لاہور) میں اور

پھر کراچی اور بعض دوسرے اہم مقامات پر پیش کی تھی۔ بعد میں اسی تقریر کو باقاعدہ مرتب کر کے "ترجمان القرآن" لاہور میں بالاقساط شائع کیا گیا۔ اور "چٹان" لاہور میں بھی یہ کئی اقساط میں شائع ہو چکی ہے۔ اب رفقا کے تقاضے کے تحت نظر ثانی کر کے اسے کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ موجودہ صورت میں یہ مضمون تقریر اور مقالے کے بین بین ایک چیز بن گئی ہے۔ اس کا مزاج تقریر کا سا ہے، لیکن ترتیب معلومات مقالے کی سی ہے۔

یہ مناسب معلوم ہوا کہ معاشیاتی موضوعات پر جو چند مضامین میرے قلم سے نکل چکے ہیں، ان کو بھی اسی کتاب میں شامل کر دیا جائے، نیز اسلام کے اقتصادی نظام کے بارے میں جن سوالات کے جوابات ترجمان القرآن یا چراغ راہ میں میرے قلم سے دیئے گئے ہیں، انکو بھی اس سلسلۂ مضامین سے وابستہ رکھا جائے۔

چنانچہ اسطرح یہ مجموعۂ اوراق خاصی معلومات کا جامع بن گیا ہے اور اس مدرسۂ فکر کے زاویۂ نگاہ کو واضح کرنے کا یہ ایک مناسب ذریعہ ثابت ہو گا جس سے راقم الحروف وابستہ ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ میری اس محنت کو قبول فرمائے، اسے قارئین کو اسلام پر مطمئن کرنے کا ذریعہ بنائے اور میری لغزشوں کو معاف فرمائے۔

نعیم صدیقی

۲۶/جولائی سنہ ۵۰ء۔ اچھرہ لاہور

کمیونزم یا اسلام؟

ہمارے ملک کے سامنے یوں بھی زندگی کی تعمیرِ نو کا مسئلہ درپیش ہے، اور ادھر اس فیصلہ کن لمحے میں ہم اپنے دروازے پر کمیونزم کی دستک کی آوازسن رہے ہیں۔ اس حال میں سرمایہ دارانہ نظام پر تو نگاہِ انتخاب پڑنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ پس اس کو درکنار رکھنے کے بعد سوال مختصر ہو جاتا ہے —— "کمیونزم یا اسلام؟"

لوگ سمجھتے ہیں کہ اس سوال کا جواب شاید اسمبلیوں کے ایوانوں سے دیا جائے گا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا وہی جواب عملی شکل اختیار کرے گا جس کا ڈھانچہ ہمارے کالجوں کے ہوسٹلوں میں بنے اور جسے ہماری درسگاہوں کے ہالوں سے نشر کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری بوڑھی نسل جو آج تمدن و سیاست کی گاڑی کھینچ رہی ہے۔ اس کو جتنا سفر طے کرنا تھا، وہ طے ہو چکا، اب وہ ہانپ ہانپ کر شاید چند اور قدم چل سکے گی، اور اس کے بعد زندگی کی گاڑی کی باگ ڈور اس نئی نسل کے حوالے کر دی جائے گی جو آج زیرِ تربیت ہے پس آپ حضرات پیشِ نظر سوال کا جو جواب طے کر کے نکلیں گے وہی دراصل نافذالعمل ہوگا، اسی وجہ سے میں نے اس دعوت کو بخوشی قبول کیا ہے

کہ اسلام اور کمیونزم کے متعلق اپنی محدود سی معلومات آپ کی خدمت میں پیش کر دوں جن کا کوئی حصّہ شاید آپ حضرات کو ایک فیصلہ پر پہنچنے میں مدد دے سکے۔

تحقیقی مطالعہ کی ضرورت

اسلام اور کمیونزم کا موضوع اگرچہ بہت ہی پامال موضوع ہے، اور گذشتہ دس سال سے سینکڑوں ہی لکھنے اور بولنے والوں نے اس پر اظہار خیال کیا ہے، لیکن یہ امر افسوسناک ہے کہ دونوں نظاموں کے وکلاء اور ان کے تقابل کے لئے بحثیں کرنے والے حضرات میں سے بہت زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جنہوں نے اوّل تو دونوں نظاموں کا ٹھوس مطالعہ کرنے کی تکلیف کبھی گوارا نہیں فرمائی۔ بلکہ سنی سنائی معلومات اور اخباری پروپیگنڈے کے فقروں کو اپنے لئے کافی سمجھا ہے، ورنہ کم از کم یہ تو روشن حقیقت ہے کہ کمیونزم کی طرف سے اسلام کے خلاف استغاثہ لڑنے والے اور اسلام کی طرف سے کمیونزم کا مقابلہ کرنے والے اکثر یک طرفہ مطالعہ رکھتے ہیں، پھر موازنہ کا یہ غیر منصفانہ طریق اختیار کیا جاتا ہے کہ کمیونزم کی طرف سے تو "سب کے لئے روٹی" کے ایک مجمل نعرے پر

آمنّا وصدّقنا کہہ دیا جاتا ہے، اور اس پر کوئی جرح نہیں کی جاتی لیکن اسلام اگر معاشی مسئلہ کے حل کی اپنی مفصّل اسکیم پیش کرتا ہے۔ تو اس کے دعوے کی صداقت پر شک کیا جاتا ہے، اس کے سارے بیان کو باریک چھلنیوں سے چھانا جاتا ہے اور اس کے ایک ایک جزء کو نہایت حسّاس ترازوؤں پر تولا جاتا ہے، میرے خیال میں پیش نظر مسئلہ اس قابل ہے کہ دو طرفہ مطالعہ کے بعد غیر جانبدارانہ تنقیدی تجزیہ کر کے دونوں نظاموں کی صحیح قدر و قیمت متعیّن کی جانی چاہئے، ورنہ ایک ذہنی پریشانی کے سوا ہر ایسی بحثوں سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

زندگی کے دو نظریئے اب میں اپنی اصلی گذارشات پیش کرتے ہوئے آپ کو اس حقیقت پر متوجہ کرانا چاہتا ہوں، کہ دنیا میں نظامِ زندگی یا دین کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں، دین یا نظام زندگی کی ایک قسم وہ ہے جس کا سرچشمہ علم خداوندی ہے، اور دین یا نظامِ زندگی کی دوسری قسم وہ ہے جسے انسانوں نے خود اپنے لئے ایجاد کیا ہو، پہلی قسم کے دین میں اخلاقی قدریں دوامی ہوتی ہیں اور اصول، روح اور فطرت کے لحاظ سے وہ ہر زمانے اور ہر ملک میں ایک ہی روپ میں

جلوہ گر ہوتا ہے۔ لیکن دوسری قسم کے دین وقتی اور عارضی قدروں کو لے کر نئے نئے پیرایوں میں جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں، کیونکہ ان کے ہر ڈھانچے کو تجربہ تھوڑی مدت میں ناکارہ قرار دے کر میدان تاریخ سے خارج کر دیتا ہے اور پھر ایک نئے ڈھانچے کی تعمیر شروع ہو جاتی ہے۔ پہلی قسم کے دین کی مرکزی توجہ انسانی اخلاق پر ہوتی ہے لیکن دوسری قسم کے دین انسانوں کی کچھ مادی ضروریات اور خواہشات کے سانچے میں ڈھلتے ہیں۔ پھر پہلی قسم کے دین میں توازن و اعتدال ہوتا ہے، لیکن دوسری قسم کے دین افراط و تفریط کی فطرت پر نشو و نما پاتے ہیں۔ پھر پہلی قسم کے دین کے پاس کچھ قطعی حدود ہوتی ہیں جن کو بدلنے کا اختیار وہ اپنے پیروؤں سے اول قدم پر سلب کر لیتا ہے، لیکن دوسری قسم کے دین اپنی حدود کو آگے پیچھے کرنے پر ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ دوسری قسم کے دینوں کی پھر دو نوعیتیں ہو جاتی ہیں، ایک وہ ہیں جو خدا کے دین کو بگاڑ کر یا اس کو جاہلیت کے ساتھ ملا کر کسی مذہب اور دھرم کی شکل دی جاتی ہے، اور ایک وہ ہیں جو خدا، پیغمبروں اور آخرت کا قطعی انکار کر کے تشکیل

پاتے ہیں، پہلی قسم کا دین ہمیشہ اسلام تھا، اور دوسری دونوں قسموں کے دین، چاہے ان کے کتنے ہی مختلف نام اور کتنے ہی مختلف ڈھانچے ہوں۔ ایک ایسے مجموعے کے اجزا ہیں جن کا نام اسلامی اصطلاح میں "جاہلیت" ہے۔

اسلام پہلی قسم کا دین ہے اور کمیونزم دوسری قسم کا۔ ان دونوں کی نوعیت میں کسی طرح بھی اس سے کم اختلاف نہیں ہے جتنا اختلاف اسلام اور عیسائیت یا اسلام اور سکھ دھرم میں پایا جاتا ہے جس طرح آپ حضرات یہ بات تصور میں نہیں لا سکتے کہ ایک مسلمان، مسلمان ہو کر عیسائی بھی ہو یا ایک مسلمان یہ دعوے کرے کہ اسلام میں اتنے فیصدی سکھ دھرم شامل ہے یا ایک مسلمان، مسلمان ہو کر تحریک صیہونیت Zionism کا پروپیگنڈسٹ یا ورکر بھرتی ہو جاتے، اسی طرح یہ بات بھی ناقابلِ تصور ہے، کہ کوئی مسلمان، مسلمان ہوتے ہوئے کمیونسٹ ہو یا کمیونسٹ پارٹی کا پروپیگنڈسٹ، یا ورکر ہو، یا اسلام کا کیمیکل تجزیہ کر کے یہ ثبوت دیتا نظر آتے کہ اسلام میں اتنے فیصدی کمیونزم موجود ہے، یا اسلام کے تقاضے دورِ حاضر میں کمیونزم کے ذریعہ بہتر طور پر پورے

ہو سکتے ہیں۔ ایسے دو دین یا دو نظام ہائے زندگی جو جڑ سے لے کر آخری کونپلوں تک ایک دوسرے سے ممتاز ہوں، جیسے آم اور کیکر — اِن کے فرق کو واضح کرنے کے لئے آخر مقالوں اور بحثوں کی ضرورت پیش آنے کی کیا وجہ ہے۔ اگر کوئی شخص یہ ثابت کرنے بیٹھ جائے کہ آم کے درخت میں اتنے فیصدی کیکر کا درخت پایا جاتا ہے، یا تیرہ سو سال پہلے جو فائدہ آم سے حاصل کیا جاتا تھا وہ اب دورِ رواں میں کیکر سے حاصل ہو سکتا ہے، تو یقین جانئے کہ دنیا کی کوئی منڈی ایسی نہیں جو اس کو جنس عقل و ہوش فراہم کر کے دے سکے۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ اسلام کیا ہے، اور دوسری طرف کمیونزم کیا ہے۔ نہ یہ کہ اسلام میں کمیونزم ہے یا نہیں اور کمیونزم میں اسلام کسی طرح کھپ سکتا ہے یا نہیں؟ راست فکری (Straight Thinking) کا طریقہ وہ ہے نہ کہ یہ!

اسلامی نظریۂ زندگی کی اساس

انسانی زندگی کے لئے کوئی نظام تجویز کرتے

ہی پہلا قدرتی سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کائنات کے جس کارخانے میں آدمی کو عمر گذارنی ہے، یہ کارخانہ اور اس کے آلات و اسباب، اس کی مشینیں اور اس میں برتی جانے والی خام جنسیں کسی مالک کی ملکیت ہیں، یا یہ سارا مال بے والی وارث ہے؟ اگر اس کارخانے کا کوئی کارخانے دار ہے تو پوری نوع انسانی کے لئے راستی کا رویہ صرف یہ ہے کہ اس میں مالک کی مرضی اور ہدایات کے مطابق مزدوری کرے۔ اسلام انفس و آفاق کی بے شمار شہادتوں سے استدلال کر کے اس حقیقت کو بنیادی حیثیت دیتا ہے کہ کارخانہ کائنات کا ایک کارخانہ دار ہے اور اس نے اس کارخانہ میں کام کرنے کے لئے انسان کو ضابطہ اور ہدایت نامہ فراہم کیا ہے، اسی نے دماغ کی قوتیں دیں، اسی نے اعضا کے آلات دیئے، اسی نے طبعی نظام کی مشینیں نصب کیں، وہی رزق کا وظیفہ دینے والا ہے، پس اس کارخانے میں اس سے آزاد ہو کر جو تصرف کیا جائے گا، وہ ایک مستقل غلطی ہے۔ پھر وہ یہ کہتا ہے کہ اس کارخانے کے ہر انسانی کارکن کی کارگذاری کا پورا ریکارڈ رکھا جا رہا ہے اور ہر فرد کا باقاعدہ (Account) کھلا ہوا ہے جس

کے مطابق پائی پائی حساب چکا دیا جائے گا۔

لادینی نظریۂ زندگی کی اساس

بخلاف اس کے سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونزم دونوں اس کارخانے کو لاوارث مال سمجھ کر اپنا پروگرام بناتے ہیں، سرمایہ دار یہ سوچتا ہے کہ اس خوانِ یغما کو جتنا لوٹ سکے لوٹے اور کمیونسٹ یہ سوچتا ہے کہ بڑے بڑے لٹیروں سے لڑ بھڑ کر جتنا ممکن ہو چھین جھپٹ لے۔ دونوں اس کارخانے میں من مانی کرنا چاہتے ہیں اور اس کے مالک کی ہدایات کو پر کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتے۔ اس نقطۂ نظر سے آپ غور کریں تو معلوم ہو گا کہ کمیونزم اسلام کی بہ نسبت سرمایہ داری سے بہت زیادہ قریب ہے۔ ان دونوں کا حسب نسب ایک ہے، اور ان کی ساری کشمکش دو اکل کھرے بہن بھائی کی سی ہے، بہر حال اسلام اور کمیونزم کائنات کے نظریہ ہی میں اپنے راستے الگ کر لیتے ہیں۔

پھر دونوں کے سامنے تصوّرِ انسان کا مسئلہ آتا ہے، اسلام انسان کو خدا کے عبد اور خدا کے نائب کی ذمّہ دارانہ حیثیت دے کر اپنا مخاطب بناتا ہے، لیکن کمیونزم انسان کو ایک "ترقی یافتہ معاشی حیوان" قرار دے

کہ اس کے حقوق اور فرائض اور اس کے مقصد زندگی پر غور کرتا ہے،
انسان کی انسانیت کا کوئی تصور خدا کا انکار کر کے کیا ہی نہیں جا سکتا۔
کائنات سے خدا کا تصور الگ کر دیجئے تو نوعِ انسانی کی حیثیت ایسی
رہ جاتی ہے کہ گویا زمین کے جسم میں کیڑے پڑ گئے ہیں یا مٹی کی اس گیند
کو دیمک لگ گئی ہے، کمیونزم تصورِ انسان میں بھی سرمایہ داری سے متحد ہے۔

نظریۂ اخلاق کا فرق

اِن دو بنیادی مسئلوں کے بعد نظریۂ اخلاق
کا سوال سامنے آتا ہے۔ اسلام اس سوال
کے جواب میں اخلاقی ارتقاء کو زندگی کے مقصد کی حیثیت دیتا ہے اور اخلاق
کے لئے مستقل قدریں سامنے لاتا ہے اور اس کے اخلاقی تقاضے کی حد یہ
ہے، کہ وہ آدمی کو اخلاق کی حفاظت میں بھوکوں مر جانے پر آمادہ کرتا
ہے، اور اخلاق کے لئے بڑی سے بڑی بازی کھیل جانے کا درس دیتا
ہے۔ بخلاف اس کے کمیونزم کی نگاہ میں مقصد زندگی روٹی ہے، اور
اخلاق خواہشات کو پورا کرنے کی جد و جہد کا نام ہے۔ نظامِ سرمایہ داری
نے خواہشات کی عبادت کرانے والا اخلاق افراد کو سکھایا تھا، کمیونزم
نے اس کا درس سوسائٹی کے مجموعے کو دیا ہے، ورنہ دونوں میں کچھ زیادہ

اختلاف نہیں ہے۔

کمیونزم کے اخلاقی نظریہ کی وضاحت کے لئے میں دو تین مختصر حوالے عرض کرتا ہوں:۔

حضرت لینن فرماتے ہیں:۔ "ہماری سوسائٹی کسی ایسے نظامِ اخلاق کو نہیں مانتی جس کی محرک انسانی معاشرہ سے باہر کوئی مافوق الفطرت طاقت ہو۔ اشتراکیت کے نزدیک ایسا نظامِ فکر و اخلاق محض فریب ہے، اور دھوکہ ہے، (مدررشیا ص۲۱۸)

ویب نے سوویٹ کمیونزم کے صفحہ ۸۳۸ پر لکھا ہے کہ:۔ "۱۹۲۳ء میں کمیونسٹ نظامِ زندگی روس پر پوری طرح مسلّط ہو چکا تھا، ایک اشتراکی رہنما سے کسی نے یہ سوال کیا کہ ایک اشتراکی کا معیار خطا و ثواب کیا ہے؟ جواب ملا کہ اس کا وہ طرزِ عمل جو اشتراکی سوسائٹی کی تعمیر کے کام آئے "ثواب" اور وہ جو تخریب کا موجب ہو، خطا ہے"

پھر لینن نے یہ بھی کہا ہے کہ:۔ "قدیم اجتماعی نظام کی بیخ کنی اور محنت کش عوام کو یکجا کرنے کے لئے ہر چیز اخلاقاً درست ہے، ہم جب اپنے دشمنوں سے لڑیں گے تو اس لڑائی میں جھوٹ اور مکر و فریب

کے ہتھیاروں کا استعمال کرنا ناگزیر ہوگا۔"

اس پر لوئیس فشر کا نقل کردہ وہ فقرہ مزید اضافہ کر لیجئے جو ایک روسی ادیب نے ایک کہانی کے کردار کی زبان سے اپنا نظریہ اخلاق واضح کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میرے سامنے اگر ایک طرف اخلاق کو رکھ دیا جائے اور دوسری طرف ایک پاجامہ ہو تو میں پاجامے کو اخلاق پر ترجیح دوں گا۔"

یہ اقتباسات گواہ ہیں۔ کہ اسلام اور کمیونزم بالکل مخالف سمتوں میں حرکت کرنے والے نظام ہیں۔ اور کسی نقطہ پر ان دونوں کا مل جانا بالکل بعید از قیاس ہے۔

نظریۂ تمدن و تاریخ

پھر دونوں تمدن کے نظریئے سامنے لاتے ہیں۔ سرمایہ داری نے فرد کو سوسائٹی کے مقابلے میں جو ناروا ترجیح دے رکھی ہے اس کے ردعمل کے طور پر کمیونزم نے فرد کی خودی کی قطعی نفی کرتے ہوئے اسے سوسائٹی کی مشین کا ایک بے شعور اور بے جان پُرزہ بنا دیا، اس کے ذوق، اس کے اختیار اس کی ذہنی آزادی اور اس کی ساری قوتوں کو سوسائٹی کی تحویل میں دے

دیا۔ بخلاف اس کے اسلام جس طرح سوسائٹی کے حقوق میں فرد کو کوئی مداخلت نہیں کرنے دیتا۔ اسی طرح سوسائٹی اور اسٹیٹ کو بھی فرد کے متعیّن حقوق کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا، یہاں بھی دونوں کے راستے الگ الگ ہیں۔ پھر دونوں کا ایک مخصوص نظریہ تاریخ ہے۔ کمیونزم کہتا ہے کہ تاریخ روٹی کے لئے انسانی جدوجہد کی داستان ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ اپنے فلسفہ کی رُو سے مجبور ہے، کہ ہر مذہب، ہر سلطنت، ہر جنگ، ہر صلح، اور ہر تہذیب و تمدّن کو روٹی کے محور کے گرد گھما کر دکھائے۔ لیکن اسلام تاریخ کو خیر اور شر، حق اور باطل، ظلم اور عدل، راستی اور ناراستی، صحیح اور غلط یا بالفاظِ جامع اسلام اور جاہلیت کی کشمکش کی داستان قرار دیتا ہے۔ جس میں اسلام کے خلاف جاہلیت نت نئے مورچوں سے جنگ آزما ہوتی ہے اور دونوں متصادم قوتیں باری باری دن اور رات کی طرح تہذیب کی فضاؤں پر غالب آتی رہتی ہیں۔ یہاں بھی اسلام اور کمیونزم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اس نظری بحث میں مَیں زیادہ دُور تک جانا نہیں چاہتا۔ یہ باتیں

جو عرض کی گئی ہیں۔ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں کہ دونوں نظاموں کے زاویہ نگاہ، طرزِ فکر اور بنیادی فلسفہ میں کھلا تضاد موجود ہے۔ اور کوئی ماہر سے ماہر نسب دان ان کے نسب کو باہم جوڑ نہیں سکتا۔

اشتراکی پروگرام

نظریات کے ان اختلافات کو پس منظر میں رکھ کر ہم آگے چلتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے کائنات اور انسان کے غلط مطالعہ کے تحت جو اصول نظامِ زندگی کی تاسیس کے لئے اختیار کئے جائیں گے وہ فطرتاً غلط ہونے چاہئیں۔ چنانچہ کمیونسٹ فکر نے جن اصولوں کو اپنے پروگرام کی بنیاد بنایا وہ یا تو قطعی طور پر ناکام ہو گئے یا اُن سے جس افادیت کی توقع کی گئی تھی وہ حاصل نہ ہو سکی۔ کمیونزم کا پروگرام تین اجزا پر مشتمل تھا۔ ایک یہ کہ انفرادی ملکیت کا کلّی خاتمہ کر کے اجتماعی ملکیت قائم کر دی جائے، دوسرے معاشی لحاظ سے تمام افراد میں کامل مساوات ہو، تیسرے مزدور راج قائم ہو جائے۔ یہ پروگرام بیش بہا قربانیوں اور تیس سال کی محنتوں کے باوجود اس سرزمین میں ناکام رہا ہے جس میں اس کا

مکمل تجربہ کیا گیا ہے۔ پروگرام کے تینوں اجزا پر چند کلمات عرض کئے جاتے ہیں۔

ا۔ قومی ملکیّت

قطع نظر اس کے کہ انفرادی ملکیت کا جذبہ ایک فطری حقیقت ہے۔ اور اس کی جڑیں تاریخ تمدّن میں اتنی دور تک اتری ہوئی ہیں۔ کہ ان کو اکھیڑ دکھانا ناممکن ہے ۔۔۔ قومی ملکیّت افرادِ انسانی کی خودی کی کامل نفی کا دوسرا نام ہے۔ کمیونزم جس نے قومی ملکیت کا تصوّر پیش کیا ہے، انسانی فطرت سے حد درجہ مایوس ہے۔ اس کے نزدیک انسانیت کا پورا کنبہ ایسے بیوقوف جانوروں پر مشتمل ہے کہ جن کے ہاتھوں میں اگر سرمایہ و وسائل کی طاقت سونپ دی جائے تو وہ "لازماً اسے اپنی نوعی برادری کو نقصان پہنچانے ہی میں استعمال کریگا" نفع پہنچانے اور خدمت و ایثار، بلکہ عدل و انصاف سے کام لینے کی توقع بھی ان سے نہیں کی جاسکتی۔ درحقیقت کمیونزم نے عیسائیت کے تصورِ انسان کو کلیسا سے چرا لیا ہے اور اپنی ساری فکر کا آغاز اس نقطہ سے کیا ہے کہ انسان پیدائشی گنہگار ہے۔ اور اس سے

انسان دشمنی سے بلند تر کسی اخلاق کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہ مخلوق امانت میں خیانت کئے بغیر کبھی نہیں رہ سکتی، لہٰذا اس پر سرے سے کوئی بھروسہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس جانوروں کے غول کا علاج صرف یہ ہے کہ اس سے ملکیت کا حق سلب کر لیا جائے اور اسے قانون، اسٹیٹ کے اقتدار، سی، آئی، ڈی اور منصوبہ بندی کی زنجیروں میں جکڑ کے رکھا جائے۔ پھر اس کے ہر فرد کی ناک میں اسٹیٹ کی زناقی کی نکیل ہو۔ تب کہیں یہ ممکن ہے کہ انسان انسان کے شر سے بچ سکے۔

انسانیت کے اس ذلیل فلسفہ کو اختیار کرنے کی وجہ سے کمیونزم نے انسان کی تربیت کرنے اور اسے ایسے عقاید اور ایسی سیرت سے آراستہ کرنے کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا جو اسے اندر سے بدلے اور ایک قابلِ اعتماد ہستی بنائے۔ اس نے اندر سے اصلاح کا آغاز کرنے کے بجائے اصلاح کو باہر سے اس پر لادنا چاہا — اور وہ بھی زبردستی! قومی ملکیت کے اصول کے نفاذ کے بعد کسی معاشرہ کے انسانوں کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں رہ جاتی، جتنی دھوبی کے بیل کی، اِکّہ بان کے گھوڑے کی اور کمہار کے گدھے کی ہوتی ہے، کہ دن بھر

مالک کے اشارہ ابرو پر محنت و مشقّت کی جاتے اور شام کو نپا تُلا چارہ وصول کر لیا جاتے۔ یہ درحقیقت انتہائی ذلیل کارروائی ہے جو آج تک اس آسمان کے نیچے کسی انسانی سوسائٹی کے ساتھ روا رکھی گئی ہے۔

دو تنقیدی سوالات

اس اصول کے خلاف دو سوال ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کا کوئی معقول اور عملی جواب کسی کمیونسٹ دوست سے اب تک سُننے میں نہیں آیا۔ پہلا سوال یہ ہے کہ جس اصول کو انسانی فطرت سے مایوس ہونے کی وجہ سے اختیار کیا گیا ہے اس کے تحت سرمایہ و وسائل کو قومی ملکیّت قرار دینے کے بعد ان کے مرکزی خزانے کا نگہبان اور اُن کے بٹوارے کا انچارج کسے بناؤ گے؟ —— کیا انہی انسانوں میں سے چند افراد کو جن کے متعلق تمہارا فلسفہ یہ کہتا ہے کہ وسائل و اختیارات پا کر یہ بہر حال موجب شر ہی ہو سکتے ہیں اور ان سے انتفاع یعنی **Exploitation** ہی کی توقع کی جا سکتی ہے؟ یا پھر کیا آسمانوں سے کچھ فرشتوں کی درآمد کا انتظام کر لیا گیا ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے۔ کہ ایک ایسی فضا جس میں قومی ملکیّت کا

اصُول اپنی مکمّل شکل میں کام کر رہا ہو ——— اور یہ ادھورا ہو، تو ناکارہ ہوتا ہے ——— اور جہاں کارخانوں اور زمینوں اور سرمائے کی دوسری شکلوں کے ساتھ پریس، اسٹیج اور اظہار رائے کا ہر ذریعہ نیشنلائیز کر کے حکومت کی تحویل میں دے دیا گیا ہو، وہاں آخر اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ افراد کی انفرادی آزادی کا حق محفوظ رہے گا؟ اور اگر وہاں مزدوروں پر اور عوام پر حکومت کی طرف سے زیادتی ہونے لگے تو اس سے بچنے یا کم از کم اس کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے کیا صُورتیں اختیار کرنا ممکن ہیں؟ نیز یہ بتایا جائے کہ اگر قومی ملکیت کے زیر اثر ملک میں ارکان و عمایدِ حکومت کسی طرح سے پبلک یا ورکرز کو (Exploit) کرنے لگیں۔ تو اس کی روک تھام کس طرح ممکن ہو گی؟

ان دونوں سوالات کے جواب میں ایک ہی چیز ہے جو کہی جا سکتی ہے ——— اور وہ یہ ہے کہ صاحب! اگر حکومت کے اکابر زیادتیوں پر اتر آئیں تو ورکرز کی سوسائٹی آئندہ انتخاب میں بہتر آدمی سامنے لا سکتی ہے جو انتظامی مشینری کو راستی سے چلائیں۔

مگر حضرات جب آپ سرمایہ دارانہ نظام پر اعتراض اٹھاتے ہیں تو آپ کو امریکہ و برطانیہ کے مُصنّفین اور سیاستدانوں کی طرف سے بالکل یہی جواب دیا جاتا ہے کہ اگر حکومت کو چلانے والی ایک ٹیم سرمایہ داروں کی آلۂ کار بنتی ہے تو پبلک کو پورا موقع حاصل ہے کہ وہ اگلی مرتبہ دوسری ٹیم لے آئے۔ لیکن آپ کو یہ معلوم ہے کہ اس جواب کی قدر و قیمت محض پروپیگنڈے کی دنیا میں ہے، واقعہ کی دنیا میں نہیں۔ بالکل اسی طرح اگر یہی جواب کمیونزم کی طرف سے دیا جاتا ہے تو یہاں بھی اس کی قدر و قیمت صرف پروپیگنڈے کی دنیا میں ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے بخلاف کمیونسٹ اسٹیٹ میں تو حکمران طبقہ عوام الناس کا رازق اور مختار کار ہوتا ہے، اور لوگوں پر نظام تعلیم، پروپیگنڈا، نشر و اشاعت، ریڈیو اور سینما کے ذریعے اپنی آرا مسلّط کرنا اس کے لئے زیادہ آسان ہوتا ہے، اور کمیونسٹ حکمرانوں کے لئے ووٹرز کو گھیر گھار کر ان تک لانے والے کمیشن ایجنٹ زیادہ سستے داموں حاصل ہو سکتے ہیں۔ پس اگر کمیونزم یہ سرمایہ داروں کا سا جواب ہمارے سامنے لاتا ہے۔ تو ہم اسے کوئی اہمیت دینے پر تیار نہیں ہیں۔ یہ جواب کتابوں میں لکھا

ہوا تو خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ عالم واقعہ میں یہ جواب کیا معجزے دکھا سکتا ہے؟

واقعات کی شہادت

اب اگر آپ کمیونزم کے نفاذ کی عملی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس قومی ملکیت کے اصول نے تشدد کو اشتراکی حکومت کی فطرت کا ایک جزو بنا دیا ہے۔ انسانیت حقِ ملکیت سے برضا و رغبت دستبردار ہونے پر تیار نہیں ہوتی۔ کارخانوں کے جن باڑوں میں مزدور دن بھر مشینوں کے آگے جتے رہتے ہیں ان پر نہ صرف یہ کہ آج تک مسلح پہرے قائم ہیں، بلکہ ان کی فضا پر حکومت کا انتظامی عملہ اور اس کی سی آئی ڈی شدت سے چھائی رہتی ہے۔ اسی طرح مشترکہ زراعت (Collective Farming) کے تحت جو ادارے قائم ہیں، وہ براہ راست حکومت کے تسلط میں ہیں اور ان کا ہر کارکن ایک بے جان آلۂ کار بن کر رہنے پر مجبور ہے۔ سٹیٹ ملک کے تمام سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو نگل کر ایک ایسا سرمایہ بن گیا ہے جس سے مسابقت (Competition) کرنے والی

کوئی دوسری طاقت سرے سے موجود نہیں ہے، چنانچہ وہ پورے اختیارات کے ساتھ جن معاوضوں اور جن اوقاتِ کارکردگی کو اور جن ضابطوں کو نافذ کر دے، کوئی راستہ ہی نہیں کہ ان کے خلاف کسی طرف سے صدائے احتجاج یا کوئی اور حرفِ تنقید بلند ہو۔ کمیونسٹ حضرات تو دنیا بھر میں ہڑتال کرنے کا حق مزدوروں کے لئے طلب کرتے پھرتے ہیں، کیا وہ اس امر کی کوئی شہادت دے سکتے ہیں کہ روس میں بھی یہ ہڑتال کرنے کا حق ورکرز کو حاصل ہے اور اسے وہ استعمال کر سکتے ہیں؟ —— اس کا جواب ایک مایوس کن نفی کے سوا کچھ نہیں۔ روس میں اسٹیٹ کی فطرت ٹھیک وہی ہے جو سرمایہ دارانہ ممالک میں سرمایہ دار افراد کی ہوتی ہے، یعنی کم از کم سرمایہ کے صرف سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنا۔ یہ رجحان سرمایہ کی Nature میں داخل ہے اور سرمائے کو جہاں بھی اُٹھا کے رکھو گے اس کی Nature اس کے ساتھ جائیگی۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ آج ایک عام روسی مزدور دو چار سو روبل ماہانہ معاوضہ پاتا ہے۔ جس کی قیمت ہماری نقدی کے مطابق دو تہائی سے کچھ کم روپوں کے درمیان قرار پاتی ہے۔ جس ملک میں ایک اچھے جُوتے

کی خریداری کے لئے ۵۰۰ روبل ماہانہ معاوضہ پانے والے کلرک اور اسٹینو کو دو ماہ کی پوری آمدنی صرف کرنی پڑتی ہو، اس میں دو چار سو روبل پانے والے مزدور کا جو حال ہوگا وہ واضح ہے۔ پھر اس قومی ملکیت کی آدم کشی کا حال یہ ہے، کہ اس نے صنفِ نازک کو "مساواتِ مرد و زن" کے نعرے کا جادو کر کے مشینوں میں لا جوتا ہے۔ اور پھر کرم فرمائی کی حد یہ ہے، کہ ایک عورت ہر دو گھنٹے کے بعد ایک مقررہ وقت پر اپنے بچے کو دودھ پلانے سے زیادہ توجہ اس پر صرف کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ چاہے اس کی مامتا کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

پھر ایک بیمار بچے کی ماں کارخانے میں حاضری دینے سے اس وقت تک مستثنیٰ قرار نہیں پا سکتی، جب تک وہ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ کے ذریعے بچے کے پاس موجود رہنے کی اہمیت ثابت نہ کر دے۔ پھر یہ قومی ملکیت کے بے رحم معاشی نظام کا کرشمہ ہے کہ آدمی اگر ڈاڑھ کے درد کی وجہ سے رات بے چینی میں گذارتا ہے اور صبح کارخانے میں لیٹ پہنچتا ہے تو اس کا کورٹ مارشل ہوتا ہے اور اس پر اتنا جرمانہ ڈالا جاتا ہے، کہ اس کی معیشت کے سارے اعصاب لرز جائیں

پھر یہ قومی ملکیت کی منصوبہ بند پالیسی کا اعجاز ہے کہ غلّہ بونے اور کاٹنے والے کسان بھوکوں مرتے رہتے ہیں، دراں حالیکہ حکومت کے برآمدی ذخائر اور گھتّے بھرے پڑے ہوتے ہیں۔ اور اس طرح غیر ممالک کو بھیجنے کے لئے مکھن کی مقررہ مقدار پوری کرنے کے لئے گوالوں کے اپنے بچّوں کو دُودھ کے ایک ایک قطرے کے لئے بلکتا چھوڑا جاتا ہے۔ اسٹیٹ سرمایہ دار کی پوزیشن میں آنے کے بعد مجبور ہے، کہ "کم سے کم صرف سے زیادہ سے زیادہ آمدنی" کے اصول پر عمل کرے[1]

پھر قومی ملکیت رکھنے والے اسٹیٹ کے سامنے چونکہ قوم کا نصب العین تمام تر معاشی ہے، اس لئے اس کی تعلیم اور اس کے پروپیگنڈے کی ساری قوتوں کی توجّہ اس بات پر مرتکز رہتی ہے کہ ہر پیدا ہونے والے بچّے کو ان صفات سے مسلح کیا جائے جو (Production)

---

[1] یہاں جن واقعات کی طرف اشارات کئے گئے ہیں ان کی مثالیں بکثرت اشتراکیت کے ناقدین نے پیش کی ہیں، میرے پیش نظر خصوصیت سے کراف شنکو کی کتاب I Chose Freedom ہے۔

کو بڑھائیں۔ تربیت کی اس پالیسی کے تحت انسان کے ان جوہروں کے پروان چڑھنے کا کوئی موقعہ نہیں رہتا جن کی ترقی پر انسانیت کی ترقی کا دارومدار ہے۔

۲۔ کامل معاشی مساوات

کمیونزم کے پروگرام کا دوسرا جزو، کامل معاشی مساوات پیدا کرنا تھا جس کی ہوس میں قومی ملکیت کی بلا کو عوام الناس نے خوش آمدید کہا تھا۔ لیکن جب لوگ دماغی اور جسمانی صلاحیتوں میں مساوی پیدا نہیں کئے گئے تو ان کی مساعی کیسے مساوی ہوسکتی ہے۔ اور مساعی جب برابر نہ ہوں تو ان کے نتائج میں برابر برابر کی حصّہ داری کس منطق سے جائز ثابت کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ مساوات کا غیر فطری تصوّر جب نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تو پہلے قدم پر ہی شکست کا اعتراف کرنا پڑا۔ اور آج جو معاشرہ روس میں قائم ہے اس میں معاوضوں کے درمیان ۱ : ۵۰ کا تناسب کھلا کھلا موجود ہے۔ روس کے مزدور کو جن لوگوں نے مساوات کے نام پر بلایا تھا۔ وہ تو ۲۰ ہزار، ۳۰ ہزار، اور ۵۰ ہزار روبل معاوضے وصول کرتے ہیں، لیکن مزدور اور کسان

بدستور چند سو روبل کے معاوضوں پر لشتم پشتم گذر کر رہے ہیں اسٹالین کا معیار زندگی تو ٹرومین کے ہم پلّہ ہے۔ لیکن اسٹالین کی اُمت کے افراد امریکہ کے مزدور کے برابر معیار زندگی نہیں رکھتے۔ ہم حیران ہوتے ہیں کہ اس معاشی مساوات کا نعرہ بلند کر کے ہماری آنکھوں میں خاک جھونکنے کی جرأت کس بے باکانہ طریق سے کی جاتی ہے۔ جس دین کے اوّلین مبلغ اور سابقون الاوّلون اپنے دین کو عمل کا جامہ نہ پہنا سکے، اس کو تابعین اور تبع تابعین آخر کہاں تک زمین پر قائم کر دکھائیں گے۔ روس کی جنت مساوات میں، روز کی روٹی روز کھانے والے بھی ہیں، اور ان کے پہلو بہ پہلو وہ لوگ بھی موجود ہیں جن کی بچتیں کئی کئی ہزار روبل کی مقدار میں خود حکومت کے بنکوں میں موجود ہیں؛ اور ان پر سود دیا جاتا ہے ——— یہی نہیں بلکہ یہ بچتیں کالے کاروبار کرنے میں بھی کثرت سے استعمال کی جاتی رہی ہیں۔ جس کا اعتراف خود حکومت کے ایک بیان میں کیا گیا ہے جو روبل کی نئی قیمت بندی کے متعلق پراودا میں شائع ہوا تھا۔ پھر روس کی جنتِ مساوات میں بالکل اسی طرح پیدل چلنے والے اور موٹر کاروں کے مالک پہلو بہ پہلو پائے

جاتے ہیں جیسے ہمارے اپنے ملک میں موجود ہیں۔

۳۔ مزدور راج

اس کے بعد مزدور راج قائم کرنے کا نعرہ باقی رہ جاتا ہے۔ عقل اسے تسلیم ہی نہیں کر سکتی کہ کوئی سٹیٹ اپنے متوسط اور بالائی طبقہ کے ذہین عناصر کو درکنار رکھ کر کارخانوں کے مزدوروں اور کھیتوں میں پسینہ بہانے والے کسانوں کو تمدّن و سیاست کی باگ ڈور سونپ دے۔ کمیونزم کے مخلص مومنوں نے ابتدا میں سوچا ہی تھا، اور غیر مزدوروں کو زندگی میں مداخلت کرنے سے الگ رکھنا چاہا تھا۔ لیکن جلد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ اس طرح کام نہ چلے گا۔ چنانچہ پھر سرمایہ دار اور متوسط خاندانوں کے نوجوان ہی بھرتی کرنے پڑے۔ کیونکہ حکومت کی مشین چلانا اس مزدور کے بس کی چیز نہیں ہے جو کپڑا بُننے کی یا اُون کاتنے کی یا ہوائی جہازوں کے پُرزے بنانے والی مشینوں کو چلانے کا ماہر ہے۔ "مزدور راج" اگر رُوس میں ہے۔ تو اس معنی میں ہے جس معنی میں امریکہ میں عوام کا راج ہے۔ کہ تم ووٹ دو اور تمہارے ووٹوں کے بل پر راج کرنا ہمارا کام ہے —— چنانچہ جو ووٹ دینے کے لئے ہیں وہ ووٹ دیتے ہیں،

اور خراج کرنے کے لئے وہ راج کرتے ہیں۔

جدید طبقہ بندی سارے پروگرام کا منشا طبقہ بندی کو ختم کرنا تھا تا کہ ایسا نہ ہو کہ سوسائٹی میں کچھ لوگ استعمال ہوتے رہیں، اور کچھ فائدے حاصل کرتے رہیں۔ لیکن ایک خدانا آشنا، بلکہ خدا پرستی سے چڑ رکھنے والی سوسائٹی اور مستقل اخلاقی حدود سے انکار کرنے والے اور جسمانی لذتوں کو اپنا گول قرار دینے والے انسانوں میں سرے سے یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ کہ طبقہ بندی ختم ہو جائے — چاہے نظام کوئی سا بھی ہو۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ہر سوسائٹی میں کچھ لوگ دماغ، مال، اثر و رسوخ اور اختیارات کے لحاظ سے فوقیت رکھنے والے ہوتے ہیں، اور کچھ ان پہلوؤں میں پسماندہ ہوتے ہیں اب اوپر والے قومی طبقہ کو آخر کون سی قوت ایسی ہے جو نیچے والے کمزور طبقہ سے ناجائز فائدے حاصل کرنے سے روک رکھے — ایک دو دن، ایک دو ماہ، ایک دو سال تک نہیں ساری عمر روک سکے! آپ ایک ہی طاقت یعنی قانون کو سامنے لا سکتے ہیں لیکن محض قانون ہمیشہ سے بے حد عاجز رہا ہے، اور ماہرین فن نے قانون کے

سائے میں قانون شکنیاں کرنے کے سینکڑوں ڈھنگ ایجاد کئے ہیں۔ دوسری چیز جسے آپ پیش کر سکتے ہیں۔ وُہ ہے رائے عام! —— لیکن رائے عام کو جتنی آسانی سے کھلے بندوں دنیا میں دھوکے دیئے جاتے ہیں اِن کے ہوتے ہوئے محض رائے عام بھی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ انسان کو قوت و اختیار کے غلط استعمال سے روکنے والی اصل چیز داخلی اخلاقی احساس ہے۔ لیکن جب آپ نے اس احساس کی بنیاد یعنی ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ ہی کو اکھیڑ ڈالا تو انسان کو درازدستیوں سے روکنے والی چیز کون سی رہ گئی۔

چنانچہ کمیونزم کے نظام الحاد میں طبقہ بندی کی ایک نوعیت ختم ہوئی تو اس نے ایک دوسرے پیرائے میں ظہور کیا۔ آج وہاں Workers اور Intellectuals کے دو مستقل طبقات نشو و نما پا چکے ہیں۔ پہلا طبقہ وُہ ہے جسے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اور دوسرا وہ ہے جو ایک لمیٹڈ فرم بنا کر پہلے طبقوں کی کمائیوں کو ایک مرکزی فنڈ میں جمع کرنے کے بعد حسبِ منشا اس کا بٹوارہ کرتا ہے۔ ورکرز کماتے ہیں اور اہلِ دماغ کھاتے ہیں۔ مشکل یہ کہ سرمایہ دارانہ نظام

ہیں مزدور سرمایہ داروں کے خلاف (Revolt) کر سکتے ہیں لیکن روس میں اہلِ دماغ کے خلاف ورکرز کے لئے انقلاب اٹھانے کے سارے دروازے بند ہیں اور ان پر کڑے پہرے قائم ہیں۔

پروپیگنڈے کا الزام

روسی معاشرہ کی زندگی میں جب کمیونزم کے اصولوں کی عملی قدر و قیمت کا جائزہ لیا جاتا ہے تو بالعموم اسے پروپیگنڈہ قرار دے کر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ہم یہ کہیں گے کہ آپ روس کے خلاف لکھے ہوتے سارے لٹریچر کو دریا بُرد کر دیجئے، اور پھر اطمینان سے بیٹھ کر یہ سوچئے کہ مذکورہ بالا تین اصولوں کو لے کر چلنے سے عملاً کیا پیش آنا چاہئے اور ان پر تعمیر ہونے والے معاشرہ میں کن کن رخنوں سے فساد کے پھوٹ نکلنے کا واضح امکان موجود ہے۔ آپ کو اس معاشرہ کی Nature خود بتائے گی کہ اس میں کیا ہونا چاہئے۔

لیکن آپ اس طرح کے سنجیدہ غور و فکر کی تکلیف بھی اگر نہ فرما سکیں، تو پھر ایک اور سوال آپ کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ آپ اس پر غور کیجئے۔ یہ مانا کہ روس میں واقعی کوئی جنت آباد ہے۔ یہ مانا کہ

اس کے متعلق سرمایہ دار ممالک کا غلط پروپیگنڈہ ہمیں غلط فہمیوں میں ڈال رہا ہے، لیکن یہ تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ جس معاشرہ کے نظام زندگی میں حق اور عدل کا جوہر صاف صاف جھلکتا ہوا موجود ہوگا، اس کی روش سرمایہ دار ممالک سے قطعاً متضاد ہوگی ـــــ اب اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے بعد یہ بتایئے کہ کیا فی الواقع روس بین الاقوامی فضاؤں میں کوئی ایسی پاکیزہ پالیسی لے کر آیا ہے جو امریکہ و برطانیہ کی پالیسی کے مقابلے میں اپنی اخلاقی فضیلت کو نمایاں کر رہی ہو؟ کیا روس جوڑ توڑ، سازباز، نفع پرستی، کمزور آزاری، دھینگامشتی اور نمائش کاری کے ٹھیک انہی ہتھیاروں سے مُسلّح نہیں ہے جن سے امریکہ و برطانیہ مُسلّح ہیں، کیا روس نے اقوامِ متحدہ کے ادارے میں مختلف کارروائیوں میں حصّہ لیتے ہوئے اپنی حق پرستی اور عدل پسندی کا ثبوت سرمایہ دار ممالک سے کسی طرح زیادہ پیش کیا ہے؟ ـــــ یقیناً نہیں۔ تو پھر جس طاقت کے معاملات گھر سے باہر غلط اصولوں پر چل رہے ہیں۔ اس کے اندرونِ خانہ کے ہنگامے آخر کیسے پاکیزہ اصولوں کے مظہر ہو سکتے ہیں؟

[یہاں تک کا مضمون "کمیونزم یا اسلام" نامی پمفلٹ میں سے لیا گیا ہے، اس حصّے کے بعد اس پمفلٹ میں اسلامی نظامِ معیشت کے بارے میں جو مباحث پیش کئے گئے تھے، وہ نسبتہً زیادہ تفصیل کے ساتھ "معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل" کی تقریر میں موجود ہیں۔]

تیسرا راستہ سرمایہ داری اور کمیونزم دونوں کے مفاسد کو جان لینے کے بعد تیسرا راستہ اگر کوئی رہ جاتا ہے تو وہ اسلام ہے۔ اور اس حالت میں ہمارا موقف جو کچھ رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ :-

"کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو"

یعنی اب جو اسلام پر پہلے سے ایمان رکھنے والے ہیں، وہ تو ہیں ہی، جن کو اسلام سے اب تک دوری رہی ہے، ان کے لئے بھی راہ نجات بجز اسلام کے اور کوئی نہیں۔

یہ البتہ واضح ہونا چاہیئے کہ اسلام موجودہ دور کی معاشی ناہمواریوں کا کوئی حل پیش کرتا ہے یا نہیں اور وہ حل ایک کامیاب سائنٹیفک

حل ثابت ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس سوال کا مختصر جواب آئندہ صفحات میں
عرض کیا جارہا ہے۔

معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل

چند ابتدائی گذارشات

پاکستان میں برطانوی اقتدار اپنے ترکے میں جس معاشی و اقتصادی نظام کو چھوڑ کر رخصت ہوا ہے۔ وہ پوری طرح سے سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ فطرت پر مبنی ہے۔ اس نظام باطل کے اوپر کڑے پہرے قائم ہیں، اس کے گرد قانون کی سنگینیں تنی ہوئی ہیں، اس کے چاروں طرف سرمایہ دارانہ روایات کے خاردار جنگلے لگے ہیں۔ اور اس کو کلچر اور تعلیم کی ایک شہر پناہ نے اپنی حفاظت میں لے رکھا ہے۔ اس نظام کے جاں نثار محافظ ہمارے وہ بھائی ہیں جن کے ذاتی اور خاندانی مفاد اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور جن کے ذہنوں پہ اس نظام کی فوقیت کا تصور انگریزی حکومت نے سالہا سال کی محنت سے مسلط کیا ہے۔

ظلم و عصیاں کا نظام

یہ اقتصادی نظام جو ہمارے سروں پہ چھایا ہوا ہے، اس سے پاکستان ہی میں نہیں دنیا کے ہر گوشے میں خطرناک مفاسد پیدا ہو رہے ہیں اور انسانیت ہر جگہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پہ مجبور ہے۔ اس نظام کا یہ خاصہ ہے کہ یہ افراد اور جماعتوں اور قوموں کو دولت پرست بناتا

ہے، یہ دولت کو چند مرکزوں میں سمیٹتا اور اس کی گردش کی رفتار کو گھٹاتا ہے، یہ امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر بناتا ہے، یہ معاشی ناہمواریاں پیدا کرتا ہے، یہ سوسائٹی کو طبقات میں بانٹ کر باہم لڑاتا ہے، یہ بین الاقوامی فضا میں جنگوں کے طوفان بپا کرتا ہے اور طاقتور قوموں کو کمزور قوموں کی صیادی میں مبتلا کرتا ہے۔ چنانچہ اس نظام کے تحت خدا پرستی، اخلاق، امن و سکون، اخوت و مساوات وغیرہ کے پنپنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

نظام سرمایہ داری کے مفاسد پر کسی لمبے چوڑے استدلال کی ضرورت نہیں۔ ہم روز اپنی آنکھوں سے اس کے کرشموں کو دیکھتے ہیں۔ کونسا دل ہے جو اس کی ناوک افگنیوں سے چھلنی نہیں ہو رہا۔ تقویٰ کی کتنی ہی کمائیاں ہیں جو اس نظام کے تنگدوں کی قربان گاہوں پر روزانہ بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں۔ رکوع و سجود کے کتنے ہی حاصل ہیں جو اس نظام کے خداوندوں کی نذر کر دیئے جاتے ہیں۔ ایمان و اخلاق کی، اور ذہانت و فطانت کی کتنی ہی متاع ہائے گراں مایہ ہیں جو اس نظام کی منڈی سے روٹی کے چند لقمے خریدنے کے لئے ہر صبح اور ہر شام کو

ہماری آنکھوں کے سامنے لٹائی جاتی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ملت اسلامیہ پاکستان کی کتنی ہی معصوم بیٹیوں کی عصمتوں کا خراج اس نظام کے خداوند ہر رات کی تاریکی میں وصول کر لیتے ہیں! کون اس کا حساب بتا سکتا ہے کہ حسب و نسب اور عزت و آبرو کے کتنے خزانے ہیں جو ہر دن کی روشنی میں اس نظام کے اکابر کے قدموں پر نچھاور کر دیئے جاتے ہیں۔ ایک ایک سکے کی خریداری کے لئے کتنے ہی جوہر قابل ہیں جو اپنے آپ کو اس نظام کے چور بازار میں نیلامی کے لئے پیش کرتے ہیں۔ یہاں زندگی بسر کرنے کے لئے انسانوں کے گلے کے گلے ہیں جو گھوڑوں اور بیلوں کا رتبہ قبول کرنے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں۔ یہاں والدین اپنی اولادوں کو سالہا سال تک پالنے پوسنے کے بعد بالکل اسی طرح لا بیچتے ہیں جس طرح گوالے اور گڈریئے بھیڑ بکریاں اور گائے بھینسیں قصاب خانوں میں لا کر بیچا کرتے ہیں۔

یہ نظام از سر تا پا ایک مہلک معصیت، ایک مہذب بدمعاشی، اور ایک منظم چور بازاری کے سوا کچھ نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ انسانی فطرت اس کو گوارا کرنے سے انکار کرتی ہے اور اس کے خلاف پوری

دنیا میں مظلوم عناصر زور کر رہے ہیں۔ چنانچہ پاکستان کے ۸ کروڑ باشندوں میں سے چند سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو چھوڑ کر پوری ملت اس نظام سے نجات حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہے۔

مرض کا علاج مرض سے سرمایہ داری اور جاگیرداری کے مفاسد کے خلاف انسانی فکر نے جب زور کرنا شروع کیا تو کمیونزم ان مفاسد کی اصلاح کے لئے میدان میں نمودار ہوا۔ چنانچہ دنیا کے اکثر گوشوں میں اس کا خیر مقدم کیا گیا، اور خاص طور پر روس کی سرزمین نے اس نو وارد طاقت کو پورا موقع بہم پہنچایا کہ وہ اچھی طرح اپنے کمالات کا مظاہرہ کرے۔ لیکن کمیونزم سرمایہ دارانہ نظام کا جو علاج اپنے ساتھ لایا ہے وہ خود مرض سے کم نہیں۔ یہ معالج اصلاح کی ذمہ داری لینے کے بجائے انتقام کا پروگرام ساتھ لاتا ہے۔ یہ بیمار کے روگ کا علاج نہیں کرتا، بلکہ اسے اس بات کی سزا دینا چاہتا ہے کہ تو بیمار کیوں ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں جراح کا نشتر نہیں ہے بلکہ قصاب کا چھرا ہے کمیونزم سرمایہ داری کے خلاف چڑچڑے جذبات کا ایک ہجوم لے کے آتا ہے اور ایک انتہا پسندی کے مقابلے میں دوسری انتہا پسندی کو اُبھارتا ہے

اس کے پیشِ نظر مرض کا علاج مرض سے کرنے کی ایک مکروہ اسکیم ہے۔
کمیونزم کے طریقِ علاج میں بنیادی خرابی یہ ہے کہ یہ انسان کی اصلاح
اندر سے کرنے کے بجائے باہر سے اصلاح کو اس پر جبراً مسلط کرنا
چاہتا ہے۔ یہ دولت مند طبقے کے افراد اور محنت پیشہ طبقے کے افراد
میں جذبۂ اخوت و تعاون پیدا کرنے کے بجائے ان کو باہم لڑانا ضروری
سمجھتا ہے۔ یہ معاشی ناہمواریوں کو ختم کرنے کے لئے افرادِ انسانی سے
آزادی اور حقِ ملکیت یا دوسرے لفظوں میں خدا کی عطا کردہ خلافت و
نیابت کے شرف کو پوری طرح چھین لینا چاہتا ہے، اور انسانی سوسائٹی
کو ڈھور ڈنگروں کے ایک گلے کی طرح چند گڈریوں کے حوالے کر دینا
چاہتا ہے۔ پھر کمیونزم ایک ملک میں اپنی معاشی اسکیم کو جاری کرنے
کے لئے لازم سمجھتا ہے کہ وہاں کے نظامِ اجتماعی کو ایک مرتبہ پوری
طرح تہ و بالا کر دے۔ اور مذہب، اخلاق، معاشرت اور قانون کی
ساری قدروں کو توڑ پھوڑ دے۔ پھر اس "سُرخ دین" کا بیت المقدس
چونکہ روس میں واقع ہے لہٰذا یہ مجبور ہے کہ جس ملک و قوم کو اپنے اثر
میں لے، اس پر روسی امپیریلزم کو مسلط کر دے۔ ان امور کو سامنے رکھنے

سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سرمایہ داری کے "سفید برص" سے نجات پانے کے لئے کمیونزم کے "سُرخ باد" کو قبول کرنا ایک خطرناک حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

ایک سوال ملک میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جو رجحانات اُبھر رہے ہیں، ان کی سربراہی کرنے والوں کو اب جذباتی پن سے الگ ہو کر گہرے غور و فکر سے کمیونزم کا جائزہ لینا چاہئے۔ اور خوب اچھی طرح سوچ کر فیصلہ کرنا چاہئے کہ سرمایہ داری سے نجات پانے کے لئے :-

۱ : کیا ہم اپنی مسلم سوسائٹی کو افتراق اور تصادم کا لقمہ بننے دیں۔ اور دین و اخلاق اور تمدن و معاشرت کی ان ساری قدروں کو تہ و بالا ہو جانے دیں جو ہماری اجتماعی زندگی کے لئے دوران خون کی سی حیثیت رکھتی ہیں ؟ کیا ہم مسلم اور مسلم کو روٹی کے بٹوارے پر لڑا مروانے کی اس ترغیب کو جاری رہنے دیں جو کمیونزم کی طرف سے دلائی جا رہی ہے ؟ کیا یہاں مسلمان کے چھرے سے مسلمان کی گردن کٹوانے کا کوئی پروگرام ہمیں پھیلنے دینا چاہئے ؟

ب:- کیا ہمیں پاکستان کی نوخیز مملکت کو اس خطرے میں ڈالنا چاہتے۔ کہ آج جبکہ اس کی قومی اقتصادیات بالکل ابتدائی درجے میں ہیں، اس کے ڈاک خانوں کو جلایا جائے، اس کی ریل گاڑیوں کو الٹا جائے اس کی پٹڑیوں کو اکھاڑا جائے، اُس کے پلوں کو ڈائنامیٹ سے اڑایا جائے۔ اور اس کے خزانوں کو لوٹا جائے۔

ج:- کیا اپنی ساری آزادیٔ فکر و عمل کو ہم ان چند افراد کے حوالے کر دینے پر تیار ہیں جو ہم ۸ کروڑ افراد کو قومی ملکیت کے کولہو کے بیل بنا کر انسانیت کے شرف سے معزول کر دینا چاہتے ہیں؟

د:- کیا اس جماعت کی پکار پر ہم لبیک کہہ سکتے ہیں۔ جو علی الاعلان پاکستان کی سرزمین میں سُرخ فوجوں کے داخلے کی "خوشخبری" سُنا رہی ہے۔ اور ایک دردناک غلامی کا پیغام دے رہی ہے؟

یہ ایک ایسا سوال ہے جس کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو ایک کرخت "نہیں" کے سوا اس کا کوئی اور جواب ایک مسلمان قوم دے ہی نہیں سکتی۔

پھر کمیونزم کا علاج ہمارے لئے اس وجہ سے بھی ناقابل قبول ہے کہ

ہم موجودہ معاشی ناہمواریوں کو دُور کرنے کے لئے اس سے بہتر اور پاکیزہ علاج خود اپنے پاس رکھتے ہیں۔ ہم دُوسروں کی "طبی امداد" کے محتاج نہیں ہیں، بلکہ ہمیں ساری دُنیا کے لئے معالج بنایا گیا ہے۔ ہم پورے اسلام پر ایمان لائے ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں اس کی رہنمائی کو موجبِ فلاح تسلیم کرتے ہیں۔ اسلام اگر نماز روزے کا دین ہے تو وہ سیاسیات و معاشیات کا دین بھی ہے، وہ اگر مسجد میں صحیح رہنمائی کرتا ہے تو یقیناً بنک، کارخانے کھیت اور بازار میں بھی صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ ہم اسلام کے دین پر اگر نکاح و طلاق کے مسائل میں بھروسہ کرتے ہیں تو یقیناً سرمایہ و محنت کے مسائل میں بھی ہمیں اس کے اصولوں کی صحت پر یقین کامل ہے اور ہونا چاہیئے۔

پھر ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کہ ہماری دستور ساز اسمبلی نے اپنی قرار داد مقاصد کے ذریعے پوری ملت پاکستان کی طرف سے یہ بات طے کر دی ہے کہ اب سرزمینِ پاکستان میں زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح اور ہر پیچیدگی اور ناہمواری کا حل اسلام کے ان اصولوں کے مطابق کیا جائے گا جن کے مجموعے کا نام کتاب و سنت ہے۔

خدا کی حاکمیت اور اس کی نیابت کے مقام پر فائز ہو جانے اور امانتِ
اقتدار کو اس کی مقررہ حدود کی پابندی میں استعمال کرنے کا اعلان کر
دینے کے بعد ہم دستوری طور پر بھی اس بات کے مجاز نہیں رہے ہیں
کہ اسلام کے سوا اپنی نگاہیں کسی اور طرف اٹھائیں —!

اب ہمارے سامنے زندگی کے سارے مسائل کا ایک ہی حل
ہے — اسلام! اسلام ہمیں ان تمام مفاسد سے بچا سکتا ہے جو
سرمایہ داری اور کمیونزم میں پائے جاتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ
ان تمام بھلائیوں کو پوری طرح قائم کر دیتا ہے جو کسی ناقص شکل میں
ان دونوں نظاموں کے اندر مخلوط ہیں۔

اسلام اور اقتصادی اصلاح

اسلام چونکہ سالہا سال سے ایک نظام کی حیثیت میں برسرِ عمل نہیں
رہا ہے۔ بلکہ اس کے چند متفرق اجزا جن کا تعلق انفرادی زندگیوں سے
تھا، لوگوں کے سامنے آسکے ہیں، اس وجہ سے یہ بدگمانی بہت پھیلتی
رہی ہے کہ شاید اسلام اجتماعی مسائل میں مداخلت کا کوئی پروگرام
سرے سے رکھتا ہی نہیں، اور شائد کچھ لوگ خواہ مخواہ کھینچ تان کر اس کو

سیاسی اور معاشی نظام کی حیثیت دے رہے ہیں۔ واقعہ یہ نہیں ہے۔ سورۂ حدید کی ایک آیت میں اسلام کا وہ مقصد بیان کیا گیا ہے جس کے لئے انبیاء مبعوث ہوتے، کتابیں نازل ہوتیں، معرکہ خیر و شر بپا کیا گیا۔ اور جس کے لئے سیاسی قوت فراہم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ فرمایا:۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

ہم نے اپنے رسولوں کو اس لئے دلائل دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ اس لئے "الکتٰب" (ضابطہ) اور "المیزان" (حکمت دینی) کو نازل کیا، کہ انسان عدل پر قائم ہو جائیں۔ اور (اسی مقصد کیلئے) لوہا پیدا کیا جس میں شدید (سیاسی) قوت (مضمر) ہے اور لوگوں کیلئے دوسرے فوائد ہیں۔

یہ آیت اپنے مفہوم میں بہت ہی صاف ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ دین کو اللہ تعالیٰ نے صرف اس لئے مرتب کیا ہے، اور اس لئے انبیاء کو بھیجا اور کتابوں کو نازل کیا ہے کہ وہ اپنی تبلیغی جدوجہد سے سیاسی قوت فراہم کر کے دین کے نظام اجتماعی کو برپا کریں، اور اس کے تحت انسانوں کو

قسط یعنی اجتماعی عدل پر جما دیں۔ ظاہر ہے کہ عدل کا قیام صرف مسجد کی صف بندی میں مطلوب نہیں ہے، بلکہ زندگی کے سارے معاملات کو ناہمواریوں سے ہٹا کر راستی و یکسانی پر قائم کر دینا اسلام کا نصب العین ہے۔ یہ بات تو انسانی عقل ہی میں نہیں آسکتی کہ زندگی کے کسی ایک یا چند شعبوں کو دوسرے شعبوں سے الگ کر کے ان میں نظامِ عدل قائم کیا جا سکتا ہے، چاہے دوسرے شعبوں میں کیسے ہی مظالم کارفرما ہیں۔ زندگی کے ایک شعبے کا بگاڑ دوسرے تمام شعبوں کو مریض بنا دیتا ہے۔ پس جس طرح کسی جسم میں کوئی حد بندی کر کے ایک طرف بیماری کی حالت برقرار رکھتے ہوئے دوسرے حصّے میں صحت قائم کر دینا ممکن نہیں ہے، اسی طرح اجتماعی زندگی کے بعض شعبوں میں فساد اور ناہمواریوں کو قائم رکھ کر بعض شعبوں میں قیامِ قسط کا پروگرام عمل میں نہیں لایا جا سکتا۔ چنانچہ اسلام اگر قیامِ قسط کی دعوت دیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ وہ پوری زندگی کے پورے مسائل میں مداخلت کرنے کا پروگرام لے کے آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں "سیاسی قوت" کی اہمیّت کی طرف واضح اشارہ موجود ہے جس کو استعمال کرنے کی

ضرورت کسی سیاسی و معاشی نظام ہی کے نفاذ اور قیام میں پیش آ سکتی ہے۔ اسلام جس طرح خدا اور بندے کے تعلقات میں عدل چاہتا ہے، اسی طرح والدین اور اولاد، شوہر اور بیوی، حاکم اور محکوم، سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور مزارع، تاجر اور گاہک کے تعلقات میں بھی راستی اور انصاف کی روح کو جاری و ساری کرنا چاہتا ہے۔ اسلام کسی جزئی معاملے میں عدل نہیں چاہتا بلکہ ایک جامع نظام عدل برپا کرنے کے لئے آیا ہے۔

معاشی ناہمواریوں میں اجتماعی ہلاکت

قرآن نے ایک دوسرے موقع پر معاشی ناہمواریوں کو اقوام کی تباہی کا راز قرار دیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ "اِذَا اَرَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا[1] مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا" (بنی اسرائیل - ۱۶)

---

[1] "اَمَرْنَا" کے معنی بعض مفسرین متقدمین نے "کثرنا" کے لفظ سے کئے ہیں یعنی چند خوشحال لوگوں کی دولت غیر فطری حد تک بڑھنے لگتی ہے۔

ان چند الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک قانون بیان فرمایا ہے کہ جب ہم کسی بستی، کسی جماعت، کسی قوم اور کسی سوسائٹی کی ہلاکت کا فیصلہ کرتے ہیں تو یہ صرف اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ خوشحال لوگ اپنی بڑھتی ہوئی دولت کے نشے میں فسق کرنے پر اُتر آتے ہیں اور ہمارے قانونِ عذاب کے تقاضے پورے ہونے لگتے ہیں، چنانچہ یہ عذاب وارد ہو جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جس سوسائٹی میں دولت کمانے کے ناجائز طریقے چلنے لگیں اور کبر اور اسراف کے مظاہرے ہوں اور تقسیم دولت میں ناہمواری ہو وہ سوسائٹی ہر لحظہ عذاب الٰہی کی زد پہ رہے گی جس اسلام نے اللہ تعالیٰ کے قانونِ عذاب اور معاشی ناہمواریوں کے اس تعلق کو واضح کیا ہے وہ یقیناً انسانی سوسائٹی کو تباہی سے بچنے کیلئے راہِ نجات بتانے کا ذمہ دار ہے۔ چنانچہ ہر نبی کی نبوت کا، ہر آسمانی کتاب کی ہدایت کا اور ہر اسلامی حکومت کے ذرائع و وسائل کا ایک واضح مصرف یہ ہے کہ وہ دولت کمانے اور خرچ کرنے کے طریقوں میں "فسق" پیدا ہونے میں مانع ہوں، تاکہ وہ ناہمواریاں نہ پھیلنے پائیں جو ایک ملک یا مملکت کو تباہی کی طرف لے جاتی ہیں۔

ایمان و اخلاق کی حفاظت کی ذمہ داری

یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کی جا سکتی جسے نبی صلعم نے خود بیان فرمایا ہے کہ ایک طرف کثرتِ مال مسلمانوں کے ایمان و اخلاق کے لئے خطرہ ہوتی ہے اور دوسری طرف افلاس ان کو دھکیل کر کفر کے قریب لے جا سکتا ہے۔ اس وجہ سے اسلامی سوسائٹی اور اسلامی حکومت اور نظامِ اسلامی کا اگر یہ بنیادی فریضہ ہے کہ وہ ایک ایک مسلمان کے ایمان و اخلاق کی حفاظت اور پرورش کا اہتمام کرے تو یقیناً اس کے لئے معاشی ناہمواریوں کے خلاف پوری طرح جدوجہد کرنا لازم ہے۔ اسلامی سوسائٹی کے ہر دوسرے دائرے کی طرح معاشی دائرے میں بھی یہ بات ضروری ہے کہ ہر مظلوم کو ظلم سے بچا کر اور ظالم کو ظلم سے روک کر اس کی مدد کی جائے؛ تاکہ کوئی فرد دنیوی اور اُخروی فلاح سے محروم نہ ہونے پائے۔

اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ اسلامی نظام کے دوسرے پہلو اور شعبے بھی ایسی فضا میں صحیح طور پر پنپ نہیں سکتے جس میں معاشی ناہمواریوں نے باشندوں کی اکثریت کو بٹ

کے مسئلے میں اس بُری طرح مبتلا کر دیا ہو کہ وہ اپنے وقت اور مال
میں سے کوئی حصہ زندگی کے اہم تر تقاضوں کے لئے نکال ہی نہ سکیں،
اور اجتماعی مسائل میں صرف چند خوشحال افراد ہی کو حصہ لینے کا موقع
مل سکے۔ پس اسلامی نظام اپنے وجود کو قائم اور اپنے مختلف شعبوں
کو برسرِ عمل رکھنے کے لئے اس کا متقاضی ہے کہ معاشرہ کو معاشی
ناہمواریوں سے پاک کیا جائے۔

خلافتِ راشدہ کی پالیسی

یہ جن اشارات کو میں نے عرض کیا ہے ان کی اہمیت کو سب سے بڑھ کر نبی صلعم کے خلیفہ اوّل نے محسوس کیا تھا۔ اور اپنے نظامِ خلافت کی پالیسی کو منبرِ خلافت سے واضح کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ:-

والضعیف فیکم قوی عندی حتی ارجع علیھا حقہٗ ان شآءاللہ والقوی فیکم ضعیف عندی حتیٰ اخذ الحق منہ انشاءاللہ	تم میں کا کمزور میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق واپس دلا دوں (اگر اللہ چاہے)۔ اور تم میں کا قوی میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے دوسروں کا حق وصول کر لوں (اگر اللہ چاہے)

آج بھی اگر کسی گوشۂ ارضی میں نظامِ اسلامی کا قیام ہوگا، تو اس کی پالیسی اسی اصولِ انصاف پر مبنی ہوگی کہ وہ حق سے زائد وصول کرنے والوں سے دوسروں کے حقوق سلب کرلے اور حق سے کم پانے والوں کو ان کے حقوق پہنچا دے۔ یہ نظام جس طرح سیاست اور معاشرت میں ناہمواریوں کو برداشت نہیں کر سکتا، اسی طرح یہ معاشی ناہمواریوں کو بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ حضرت ابوبکرؓ کے اعلان کو حضرت عمرؓ نے اپنے الفاظ میں یوں دوہرایا تھا:-

واللہ! ما منکم اقوی عندی من الضعیف حتی اخذ لہ الحق ولا اضعف عندی من القوی حتی اخذ الحق منہ (الفاروق عمر: محمد حسین ہیکل)

خدا کی قسم! تم میں سے کوئی شخص میرے نزدیک ایک ضعیف سے زیادہ قوی نہیں ہے جبتک کہ میں اس کا حق اُسے وصول نہ کرا دوں اور تم میں سے کوئی میرے نزدیک ایک قوی سے زیادہ کمزور نہیں جب تک کہ میں اس سے دوسروں کے غصب کردہ حقوق سلب نہ کرلوں۔

اپنی اس خلافتی پالیسی کو ایک موقع پر مزید وضاحت کرتے

ہوتے خلیفۂ دوم نے یہاں تک فرمایا کہ کمزوروں کا حق مارنے والوں کا ایک گال میں زمین پر رکھونگا اور دوسرے گال پر اپنا پاؤں رکھ کر پورا حق وصول کرلوں گا، اور اس معاملے میں خود اپنا گال بھی اسی طرح مسلمانوں کے سامنے زمین پر ڈال دوں گا۔ او کما قال

پس ایک مسلمان فرد اور جماعت اور حکومت اگر معاشی ناہمواریوں کے استیصال کے لئے کمربستہ ہوتی ہے تو وہ اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ دنیا میں اس کا مطالبہ و چرچا ہو رہا ہے، یا کمیونزم کی روک تھام کے لئے اور اس کی چیرہ دستیوں سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے بلکہ یہ کام تو اس لئے کرنا ضروری ہے کہ یہ خود اسلام کے پروگرام میں شامل ہے اور اس کے قیام و استحکام کا یہ ایک بنیادی تقاضا ہے۔

معاشی اِصلاح کی اسلامی اسکیم

اسلام معاشی اصلاح کی جو جامع اسکیم لے کے آیا ہے وہ چار اجزا پر مشتمل ہے۔ اس اسکیم کا پہلا جزء ذہنی و اعتقادی اصلاح ہے یعنی اسلام آدمی کا زاویۂ نگاہ ایسا بناتا ہے اور اس کے طرزِ فکر کو ایسی تربیت دیتا ہے کہ ایک ایک فرد رضا کارانہ طور پہ اس کے نظامِ عدل کا پرزہ بننے کے قابل ہو جائے۔ اس اسکیم کا دوسرا جزء تعمیر اخلاق ہے۔ اسلام ایک ایک فرد میں اس کی اعتقادی اصلاح کے بعد ایسے اخلاق کے بیج بوتا ہے جو خیر و صلاح کے برگ و بار لاتے ہیں۔ پھر اس کی اسکیم کا تیسرا جزء یہ ہے کہ وہ با اخلاق افراد سے ایک ایسا صالح معاشرہ تعمیر کرتا ہے جس کے ماحول میں مفاسد خود بخود مرتے ہیں اور بھلائیاں خود بخود نشو و نما پاتی ہیں۔ اس اسکیم کا چوتھا جزء یہ ہے کہ وہ قانونی تدابیر سے ان رخنوں کو بند کرتا ہے جن سے کوئی بگاڑ سر اٹھا سکتا ہے۔ جس طرح سیاست اور معاشرت کے لئے اسلام کا اصلاحی پروگرام انہیں چار اجزا پر مشتمل ہے، بالکل اسی طرح اقتصادی اصلاح کا اسلامی پروگرام بھی انہی چار اجزا سے مرکب ہے۔ اس پورے پروگرام پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہو

سکتا ہے۔ کہ کس وسیع اور دُور رس حکمت سے پوری منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ یہاں معاملہ یہ نہیں ہے کہ کوئی سطحی جذباتی نعرہ لے کے "توڑ پھوڑ دو" کا ایک پروگرام اختیار کیا گیا ہو، یا اندھا دھند ہر مرض کا علاج قومی ملکیت (Nationalization) کو قرار دے دیا گیا ہو، بلکہ یہاں اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ انسان کے حق آزادی اور حق ملکیت کو سلب کئے بغیر اور اس پر پوری اصلاح باہر ہی باہر سے بالجبر مسلط کئے بغیر سوسائٹی کو ایک ایسا نظامِ عدل فراہم کر دیا جائے جس کے تحت معاشی ناہمواریوں کا وجود برقرار نہ رہ سکے۔ اس اسکیم کے تحت انسانی طبقات کو لڑانے کی بجائے ان میں تعاون پیدا کر کے بغیر کسی خون خرابے کے ایک تدریج سے ہمہ گیر انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔

اب معاشی اصلاح کی اسلامی اسکیم کے چاروں اجزا پر الگ الگ گفتگو کی جائے گی۔

۱۔ اعتقادی اثر اندازی

یہ صداقت کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ آدمی کے طرزِ عمل کا دارومدار

بڑی حد تک اس زاویۂ نگاہ پر ہوتا ہے جسے لے کے وہ تمدّن کے میدان میں داخل ہوتا ہے۔ ایک شخص کسی کھلے جنگل میں داخل ہو کر جنگلی پھلوں سے جس بے تکلفی سے استفادہ کرتا ہے وہ بے تکلفی وہ کسی ایسے باغ میں استعمال نہیں کر سکتا جس کے متعلق اسے معلوم ہو جائے کہ اس کا کوئی مالک ہے۔ یہ محض زاویۂ نظر کا فرق ہے جس نے دونوں مواقع پر طرزِ عمل میں فرق پیدا کر دیا ہے۔ بالکل اسی طرح دنیا اور انسان کے متعلق مختلف اعتقادات مختلف طرزِ عمل پیدا کرتے ہیں۔ اسی حقیقت کو سامنے رکھنے سے قدرتی طور پر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نظامِ سرمایہ داری کے مفاسد کی اصل جڑیں وہ باطل معتقدات ہیں جنہوں نے دنیا کو مادّے کا کرشمہ، انسان کو حیوان، اخلاق کو نفع پرستی، اور تمدّن کو انسانی طبقات کا اکھاڑہ قرار دیا ہے۔ بخلاف اس کے اسلام آدمی کو ایک ایسا زاویۂ نظر دیتا ہے جس سے اس کے طرزِ عمل میں حد درجہ کا ذمہ دارانہ پن پیدا ہو جاتا ہے۔

قرآن صحیفۂ فطرت سے اخذ کردہ دلائل کا ایک انبوہ اس سچائی کو واضح کرنے کے لئے جمع کر دیتا ہے کہ کارخانۂ کائنات میں جو نظم، قانون

حسن اور ارتقا پایا جاتا ہے یہ ایک با اختیار خالق، ناظم اور حاکم کا کرشمۂ کار ہے، اور اس کارخانے میں مادر پدر آزادی کی کوئی جگہ نہیں چنانچہ وہ دوسری صداقت یہ سامنے لاتا ہے کہ انسان خالق کائنات کا "عبد" خلیفہ اور ایجنٹ ہے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ جس طرح دنیا کے تمام موجودات کے لئے ضابطہ کارفرما ہے اسی طرح انسان کو جو شعور و اختیار دیا گیا ہے اس کے استعمال کے لئے بھی ضابطہ ہے، جسے خدا کے انبیا لاتے رہے ہیں۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ یہ ارضی زندگی جس دائمی زندگی کا پیش خیمہ ہے اس کے برا یا بھلا ہونے کا دار و مدار موجودہ آزمائشی زندگی کے صلاح و فساد پر ہے۔

یہ تصورِ حیات اور عقیدۂ زندگی اس طرزِ عمل کی بنیاد بننے کے لئے قطعاً ناساز گار ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے تحت افرادِ انسانی میں پیدا ہو جاتا ہے۔

نظامِ معاشیات اور اسلامی عقاید

یہ بنیادی عقیدۂ حیات جسے میں نے بیان کیا ہے، زندگی کے ہر شعبے کے لئے کچھ تفصیلی عقاید بھی مہیا کرتا ہے، چنانچہ اسلامی نظام

معیشت میں افراد کی جدوجہد بعض خاص اعتقادی حدود کی پابند رہتی ہے اور یہ ضروری ہے کہ ان کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔

(۱) خدا کی رزاقی ——— اسلام نے انسان کو پورا اطمینان دلایا ہے کہ جس خدا نے تجھے پیدا کیا ہے۔ اس نے تیری ضروریات کا انتظام بھی کیا ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا زمین میں حرکت کرنے والا کوئی ایسا جاندار نہیں ہے جس کے رزق کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے نہ لے رکھی ہو۔ پھر فرمایا خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔ زمین و آسمان میں جو کچھ پیدا کیا گیا ہے وہ تمہاری ضروریات پوری کرنے کے لئے ہے۔ دراصل اس عقیدہ کو ذہنوں میں اتارنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسانوں میں اوچھا پن، کم ظرفی اور پھر اس سے بڑھ کر رزق کے لئے ہاتھا پائی کی صورت پیدا نہ ہونے پائے۔ انہیں بھروسہ ہونا چاہیئے کہ خزانوں کا ایک مالک خود ان کی ضروریات کی فراہمی کا ضامن ہے

(۲) تفاوتِ رزق میں آزمائش ——— یہ ظاہر ہے کہ فطرت میں ہر پہلو سے اختلاف اور تفاوت کارفرما ہے۔ چنانچہ افرادِ انسانی

کی قابلیتوں میں، ذہنی صلاحیتوں، جسمانی قوتوں اور پیدائشی اور اکتسابی سہولتوں کے لحاظ سے گوناگوں اختلافات ہیں جو نظامِ تمدّن میں اپنا کام کرتے ہیں۔ صلاحیتوں کا اختلاف جدوجہد میں اور جدوجہد کا تفاوت کمائیوں میں تفاوت پیدا کرتا ہے۔ اس تفاوت کے متعلق قرآن بیان کرتا ہے کہ اس کے ذریعے انسان کو خیر و شر کے ایک امتحان سے دوچار کیا گیا ہے تاکہ وہ اپنی بھلائیوں اور برائیوں کو نمودار کر سکے! فرمایا:۔

هُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَآ اٰتٰكُمْ	خدا وہ ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجوں کی فوقیت اس لئے دی کہ وہ اپنے عطیات کے بارے میں تمہیں جانچے۔

اس ارشاد سے اللہ تعالیٰ کا مدعا یہ ہے کہ تم زمین میں شتر بے مہار بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو، بلکہ تم ہمارے نائب اور ہمارے مقرر کردہ کارندے ہو اور تمہارا کام بے لگامی سے دنیا میں تصرّف کرنا نہیں ہے، بلکہ رزق کے حصول و صرف میں ہماری رضا اور ہمارے قانون کو پوری طرح

ملحوظ رکھنا ہے ہم نے تم کو جو ذرائع و رسائل اور حصّۂ دولت دیا ہے اس کے ذریعے ہم تمہاری آزمائش کرنا چاہتے ہیں کہ تم کیا رویہ اختیار کرتے ہو۔ یہ حصّۂ دولت اور یہ ذرائع و رسائل خدا کی اطاعت اور نوعِ انسانی کی خدمت میں صرف ہوتے ہیں یا خدا سے بغاوت کرنے اور اس کے بندوں کو محروم تر بنانے میں استعمال ہوتے ہیں۔ زیادہ حصّہ پانے والے کا امتحان اس بات میں ہے کہ وہ کم پانے والے کے متعلق اپنی ذمہ داری کو کس حد تک محسوس کرتا ہے۔ اور کم پانے والوں کا امتحان اس بات میں ہے کہ وہ زیادہ پانے کے لئے خدا تعالیٰ کی حدود کو تو نہیں توڑتا۔

۳۔ محاسبہ اور جواب طلبی کے تصوّر سے امتحان کے تصوّر کی تکمیل کے لئے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ ایک دن زندگی کی ساری سرگرمیوں اور معاشی جد و جہد کے سارے ہنگاموں کا باقاعدہ محاسبہ بھی ہونا ہے اور تفاوت رزق نے جو ذمہ داریاں نوعِ انسانی پر ڈال دی ہیں۔ ان کے بارے میں جواب طلبی بھی ہوتی ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ ”لَتُسْئَلُنَّ عَنِ النَّعِیْم“ تم سے ان تمام نعمتوں کے بارے

میں باز پرس ہوگی۔ جو تمہیں تفویض کی گئی تھیں کہ ان کا استعمال کن مقاصد کے لئے کیا گیا اور آیا ان کا حق شکر ادا کیا گیا یا نہیں؟

معتقدات کا جوہر ان سارے معاشیاتی معتقدات کا جوہر ایک آیت میں سمیٹ دیا گیا ہے:۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ	جان لو کہ خدا اور آخرت سے بے نیاز
الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِیْنَةٌ	دنیوی زندگی ایک کھیل کود ہے، ایک
وَّتَفَاخُرٌۢ بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی	سجاوٹ ہے اور تمہاری آپس کی
الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ط کَمَثَلِ	مفاخرت اور اموال و اولاد میں ایک
غَیْثٍ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ	دوسرے سے آگے بڑھنے کی ایک جد و
نَبَاتُهٗ ثُمَّ یَهِیْجُ فَتَرٰىهُ	جہد ہے جس کا حال اس کھیتی کا سا ہے
مُصْفَرًّا ثُمَّ یَکُوْنُ حُطٰمًا	کہ اس کی روئیدگی دہقانوں کا دل لبھاتی
—— وَفِی	ہے۔ پھر وہ شباب پر آتی ہے۔ اور تم اسے
الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ وَّ	پک کر زرد ہوتے ہوئے دیکھتے ہو۔
مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ج	اور پھر کسی بلائے ناگہانی سے وہ بھس
وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا اِلَّا	بن کے رہ جاتی ہے —— اور

مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ط سَابِقُوْا
اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ
جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ
وَالْاَرْضِ ج اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۔

(دوسری طرف) آخرت (کی زندگی ہے جس) میں (کسی کے لئے) عذاب شدید ہوگا (اور کسی کے لئے) اللہ کی رضا و مغفرت ہوگی۔ تو پھر دنیا کی زندگی (کی حقیقت) کیا ہے۔ بجز اس کے کہ دھوکے کی ایک ٹٹی ہے۔ (پس) لپکو اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی اُس وسیع جنت کی طرف، جس کی وسعتیں ایسی ہیں جیسے آسمان و زمین کی پہنائیاں، اور جسے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے والوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔

آیت کا منشا یہ ہے کہ زندگی کا ایک ڈھنگ تو یہ ہے کہ دولت کے کمانے اور معاشی فوقیت کی جدوجہد کرنے میں آدمی اپنی نازک ذمہ داریوں سے آنکھیں بند کر کے کھو جائے۔ اس طرز پر جو زندگی کائنات کے مالک و حاکم کے منشا سے آزاد ہو کر اور آخرت

کی جواب طلبی سے بے نیاز ہو کر بسر کی جائے گی اس کی حیثیت ایک فصل کی عارضی سر سبزی کی سی ہے جو آخر کار یکایک تباہ ہو کے رہ جاتی ہے اور کسان کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ زندگی بسر کرنے کا دوسرا ڈھنگ یہ ہے کہ آدمی ساری معاشی سرگرمیوں میں اپنی نگاہیں آخرت کی عدالت کے محاسبہ پر اور اس کے نتیجے میں ملنے والی دوامی زندگی پر جمائے رکھے۔ اس طرز پر جو زندگی استوار ہو گی اس میں ساری مسابقت خدا تعالیٰ کی عبادت اور اخلاقی ارتقا اور نوع انسانی کی سچی خدمات کی انجام دہی میں ہو گی۔ اسلامی معتقدات اسی طرز زندگی کو اُبھارنے والے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرز زندگی اور سرمایہ دارانہ طریق حیات میں نہایت درجہ کھلا تضاد موجود ہے۔

اسلامی عقاید کی تجدید کی ضرورت

یہ اسلامی معتقدات جو انسانوں کے معاشی تعلقات پر گہرا اثر ڈالتے ہیں، مدتوں کی ناسازگاریٔ ماحول کی وجہ سے مسلمانوں کے ذہنوں میں ٹھٹھر گئے ہیں۔ ان معتقدات کی نہ آبیاری ہوئی، نہ ان کی تربیت کا کوئی تسلی بخش انتظام ہو سکا، نہ ان کی حفاظت کے

لوازم فراہم کئے گئے، چنانچہ ان معتقدات کا چرچا باقی ہے، لیکن ان میں اتنی جان نہیں رہی کہ یہ افراد کی عملی زندگیوں پر اثر انداز ہو سکیں۔ اب اگر پاکستان میں اسلامی نظامِ معیشت کو استوار کرنا ہو تو یہاں کی حکومت کو سب سے پہلے اسلامی عقاید کی تجدید پر پورا زور صرف کرنا پڑے گا۔ آج اگر نظامِ تعلیم، ریڈیو، سینما، لٹریچر اور اخبارات، خطیب اور مقررین، ائمۂ مساجد اور سیاسی ورکر ان عقاید کے بحال کرنے کے لئے اور اسلامی زاویۂ نگاہ کے احیاء کے لئے ہمہ تن مصروف ہو جائیں تو دو تین سال کے اندر ہمارے ملک کی اکثریت کی ذہنیتیں اسلامی سانچے میں ڈھل سکتی ہیں۔

آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر ہمارے معاشرہ کے افراد کی ایک بڑی تعداد اسلام کے معاشی معتقدات کو پوری طرح اپنے اندر پیدا کر لے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے جونک بننے کی ذلت اختیار کر سکے، یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنے کاروبار کی گاڑی میں گھوڑے اور گدھے کی طرح جوتنے پر تیار ہو، یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان

کی گردن پر "پیرِ تسمہ پا" بن کر سوار ہو اور یہ ممکن نہیں ہے کہ دولت مند مسلمان غریب مسلمانوں کو اپنا لقمہ بنانے کے لئے معاشیات کے سمندر میں ماہی گیری کرتے نظر آئیں

(۲) تعمیرِ اخلاق

لیکن اسلام عیسائیت کی طرح صرف چند عقاید قبول کرانے کے لئے سفارش کر کے الگ نہیں ہو جاتا، بلکہ ان کے پورے استحکام کے لئے اور ان کو عملی زندگی میں مؤثر بنانے کے لئے عباداتِ خمسہ کا تربیتی پروگرام اختیار کرتا ہے اور اس طرح وہ اپنے پیش کردہ عقاید پر افراد کی ایک نئی معاشی سیرت تعمیر کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسلام کی تعمیرِ اخلاق کی اس اسکیم کا آپ کے سامنے تعارف کرا دوں۔ جس کے بغیر اسلام کے معاشی نظام کی اٹھان ہو ہی نہیں سکتی۔

زندگی کا اونچا نصب العین معاشی اخلاق کی تعمیر میں اسلام نے اوّلین اہمیت اس چیز کو دی ہے کہ وہ مسلم سوسائٹی کے ایک ایک فرد کے سامنے زندگی کا ایک وسیع اور اونچا نصب العین ایسا رکھتا ہے۔ جو اسے معاشی حیوان کے درجے

تک نہ گرنے دے اور اس کا جینا کھانے کے لئے نہ ہو، بلکہ کھانا جینے کے لئے اور جینا اعلیٰ تر منتہا کے لئے ہو، قرآن نے ایک مسلم کی اصل ذمہ داری کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے۔ کہ:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ	تم وہ بہترین اُمت (پارٹی) ہو جسے نوع انسانی (کی خدمت) کے لئے پیدا کیا گیا ہے، سو تم بھلائی کا حکم کرنے والے اور بُرائی کو روکنے والے ہو۔

یہ آیت ہر فرد مسلم کو زندگی بھر کے لئے ایک ڈیوٹی پر مامور کرتی ہے۔ کہ وہ اپنے زیادہ سے زیادہ وقت اور مال اور قوتوں کو نوع انسانی کے صلاح و فلاح کے لئے استعمال کرے۔ اس عالمگیر اور دوامی ذمہ داری کا احساس جن لوگوں میں نشو و نما پالیتا ہے۔ ان کے لئے دولت سمیٹنے، سکے گنتے رہنے اور عیاشی اور تفریحات میں اپنے آپ کو مصروف کر دینے کا کوئی موقع نہیں رہتا۔ یہ اسی اونچے نصب العین کا فقدان ہے جس نے مغربی اقوام میں سرمایہ داری کو نشو و نما دی ہے۔ اور اسی نصب العین کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کے بعد ہی ہماری سوسائٹی میں دین

سرمایہ داری کو فروغ پانے کا موقع ملا ہے۔ اسلام خدمت انسانیت کے مقصد اعلیٰ کے لئے ایک ایک مسلم فرد کو ایسا سپاہی بنا دینا چاہتا ہے۔ جو نیکی کی ہر شکل کو غالب کر دینے کے لئے برائی کی ہر شکل سے برسرِ پیکار رہے۔ ان سپاہیوں کو یقیناً اپنی قوتوں کی بحالی کے لئے رزق کی ضرورت ہے۔ لیکن خیر و شر کی جنگ میں عین مورچے پر آنے کے بعد ان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے۔ کہ اپنی ساری توجہ کھانے پینے کے مسائل پر صرف کر دیں۔ خدا کی نیابت و خلافت کی بھاری ذمہ داری کو محسوس کر لینے کے بعد کسی مسلم کے لئے اس کا موقع کہاں۔ کہ وہ اپنی ساری زندگی کو معدے کے محور پر گھما دے۔ اور ایک جانور کی طرح دن رات چارے اور گھاس کے پیچھے پڑا رہے۔

معاشی جدوجہد میں پابندیٔ حدود | ایک اونچا نصب العین انسان کے سامنے رکھ دینے کے بعد اسلام اس سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ضروریات پوری کرنے کے لئے جو جدوجہد کی جائے۔ اس میں اخلاقی حدود کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھا جائے۔ اپنے حصے کا رزق حاصل کرنے کے لئے وہ دوسروں کی

حق ماری کرنے سے روکتا ہے۔ اور یہ احساس بیدار کرتا ہے کہ کمائی کی ہر کوشش بھلے طریق سے کی جائے قرآن نے انبیا کو اور ان کی معرفت ہر فرد مسلم کو یہ ہدایت دی ہے۔ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا۔ یعنی اپنا رزق "طیبات" تک محدود رکھو اور عمل صالح پر کاربند رہو۔ اسلام کے پورے معاشی فلسفہ کا جوہر ان چند لفظوں میں سمٹ گیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ حصولِ رزق میں پورا اہتمام اس بات کا ہونا چاہئے کہ طیبات حاصل ہوں، روزی پاکیزہ ہو، ذرائع اور وسائل جائز قسم کے ہوں۔ اور ساری معاشی جدوجہد میں "عملِ صالح" کی پابندی کی جائے۔ اس آیت کو مدتہائے مدید سے پامال کیا جا رہا ہے اور اس میں جس معاشی اخلاق کا مطالبہ کیا گیا تھا وہ عملی زندگی سے بے دخل ہو چکا ہے۔ آج رزق اور ذرائع و وسائل طیبات کی جگہ محرمات اور مکروہات پر مشتمل ہیں۔ اور دولت کی ساری قوت "عملِ صالح" کی جگہ مُفسدات کے فروغ میں صرف ہو رہی ہے اور اسی نامطلوب حالت کے موجود ہونے کا نام سرمایہ داری ہے۔

نبی صلعم نے قرآن کے اسی مُدعا کو اَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ" کے

کلمات میں سمو دیا ہے یعنی حصولِ رزق کی مساعی میں اخلاقی جمال برقرار رہنا چاہیئے۔

اصولِ کفاف کی ترغیب

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

اَفْلَحَ مَنْ اَسْلَمَ وَ کَانَ رِزْقُهٗ کِفَافًا — فلاح پائی اُس نے جو اسلام پر کاربند ہوا اور جس نے رزق کفاف پر گذر کی۔

پھر آنحضور نے خدا سے یہ دعا کی کہ:-

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْ اٰلَ مُحَمَّدٍ کِفَافًا — اے اللہ! آلِ محمد کو رزق کفاف عطا فرما۔

رزقِ کفاف سے مراد یہ ہے۔ کہ آدمی کو اتنی روزی حاصل ہو جائے کہ وہ ایک مسلم کی ایمان، اخلاق، اور آبرو سے بھری ہوئی زندگی بسر کرنے کے لیئے روزمرہ کی ضروریات کو بخوبی پورا کر سکے اور زائد از ضرورت رزق کو جمع رکھ چھوڑنے سے بے نیاز رہ سکے۔ اوپر فرد کی جو ذمہ داری بیان کی گئی ہے۔ اس کے تقاضے اگر کسی کے پیشِ نظر

ہوں تو وہ رزق کفاف سے زیادہ کمانے کے لئے وقت نکال ہی نہیں سکتا۔ اور نکالے تو عمل صالح کی پابندی کے ساتھ طیبات پر اکتفا کرنے کی صورت میں وہ تجوریوں کو بھرنے کی کوئی مہم لے کے چل ہی نہیں سکتا۔ ایک مسلم فطرۃً مجبور ہے کہ وہ رزق کفاف پر نگاہ جمائے۔ اور معاشی جدوجہد سے جتنا وقت اور جتنی قوتیں بچا سکے وہ خدا کی عظیم تر عبادات کے انجام دینے اور انسانیت کی خدمت میں صرف کر دے۔ لیکن اگر کسی شخص کی قوتیں دولت پیدا کرنے ہی کے لئے خاص ہوں تو اس کے لئے بھی فلاح کا محفوظ ترین راستہ یہی ہے کہ وہ اپنی کمائی میں سے رزقِ کفاف اپنے لئے رکھ لے۔ اور بقیہ مال کو دوسرے افرادِ معاشرہ اور نظام اسلامی کی خدمت کے لئے صرف کرے۔ اسلامی قانون کا نہ سہی، اخلاق کا تقاضا یہی ہے۔

نبی صلعم کے صحابہ کرام کا مسلک یہی تھا کہ وہ حصولِ رزق پر اوّل تو توجہ ہی کم سے کم ضروری حد تک دیتے تھے۔ اور اگر " اللہ کا فضل " ضروریات سے زیادہ ہوتا تو اسے اسلام اور مسلمانوں کی ضروریات میں صرف کرنے کے لئے تیار رکھتے تھے۔ اسی اخلاقی مسلک کو حضرت ابوذر

نے قانون کی حیثیت دینی چاہی تھی، لیکن حضرت عثمانؓ نے اخلاقی قانون کو عدالتی قانون بنانے سے بجا طور پر انکار کر دیا تھا۔ تاہم حضرت ابوذرؓ جس مسلک کفاف کے داعی تھے وہ بجائے خود ایک اہم اخلاقی اصول ضرور تھا۔ اور یہ اصول ایک مسلم کے پیش نظر رہنا چاہئے اسلام کو خزانے جمع کرنے اور سکّوں کی گنتی کرتے رہنے کی ذہنیّت ہی سرے سے نا مرغوب ہے چنانچہ قرآن نے جابجا اسے کراہت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ایک جگہ کہا کہ:-

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ۔	اپنا والہ و شیدا بنا رکھا ہے تم کو مال بڑھانے کی جدوجہد نے، یہاں تک کہ تم قبروں میں جا اترو۔

دوسری جگہ زر پرستانہ کردار کو پیش کیا کہ:-

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۨ ۙ الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۚ	تباہی ہے ہر اس طعن باز عیب چیں کے لئے جس نے دولت سمیٹی اور پھر اسے گن گن کر رکھا اور سمجھتا یہ ہے کہ اسکی دولت ہمیشہ اس کا ساتھ دیگی

جس معاشی ذہنیّت و کردار کو اِن آیات میں مکروہ کر کے دکھایا گیا ہے؛ اسے ترک کرنے کے بعد لازماً اصُولِ کفاف ہی کا اخلاقی مسلک باقی رہ جاتا ہے۔ یہ مسلک اگر کسی سوسائٹی میں رائج ہو تو اس میں معاشی ناہمواریوں کا برقرار رہنا ناممکن ہے۔

ترغیب انفاق اصولِ کفاف کے اندر در اصل انفاق کا اصُول خود شامل ہے۔ اسلام اپنے زیر اثر لوگوں سے بہت ہی شدّت سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وُہ غلبۂ دین کے لئے اسلامی حکومت اور اسلامی سوسائٹی کے لئے اور ضرورتمند افراد کی شخصی امداد کے لئے اپنے مال صرف کریں۔ قرآن کی لرزا دینے والی آیات میں سے آیتِ کنز بھی ایک ہے۔ فرمایا:۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔	اور جو لوگ سونے چاندی کے خزانے جمع کر رکھتے ہیں اور اُن کو اللہ کی راہ میں صرف نہیں کرتے، اُن کو خوشخبری سنا دیجے عذاب الیم کی!

چنانچہ یہ خوشخبری اِن الفاظ میں سنائی گئی:۔

فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ۔

پس سونے چاندی کی ٹکلیوں (کو تپا تپا کر) اُن سے، اُن کی پیشانیوں اور اُن کے پہلوؤں کو داغا جائے گا۔

پھر اربابِ بخل کے بارے میں فرمایا کہ:۔

لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۔

کنجوسوں کے متعلق یہ نہ سمجھو کہ اللہ نے اُن کو جو مال دے رکھا ہے وہ اُن کے لئے مفید ہے، نہیں وہ اُن کے لئے مضر ہے۔ قیامت کے دن اُن کی کنجوسی کا سارا حاصل طوق (طوق لعنت) بنا کر اُن کی گردنوں میں لٹکایا جائیگا

یہ وہ آیات ہیں جنہوں نے صحابہ کرام کے دلوں کو جھنجھوڑ دیا تھا اور وہ مضطرب ہو ہو کر یہ معلوم کرتے تھے کہ ان کو اپنے مالوں کو کیا کرنا چاہئے۔ اور یقیناً ان وعیدوں کو معلوم کرکے ایک مسلم کا حال یہی ہونا چاہئے۔

یہ صحیح ہے کہ آیت کنز میں اکتناز کی جو انتہا بیان کی گئی ہے۔ ادائے

زکوٰۃ کی صورت میں وہ باقی نہیں رہتی۔ لیکن یاد رہے۔ کہ صرف زکوٰۃ دینے سے حق انفاق ادا نہیں ہوتا۔ زکوٰۃ تو ایک قانونی مطالبہ ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کے اخلاقی مطالبات بھی ہیں۔ اور ان کو پورا کئے بغیر آدمی کو اپنی عاقبت کے متعلق مطمئن نہیں ہو جانا چاہئے۔ نبی صلعم کی تصریح ہے۔ کہ:۔

ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ	زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں (خدا اور بندوں کے) حقوق ہیں۔

اِن حقوق کی ادائی کے طریقے کو ایک دوسری حدیث واضح کرتی ہے۔ حضرت ابوذرؓ کا بیان ہے۔ کہ نبی صلعم ایک مرتبہ دیوارِ حرم کے سائے میں تشریف رکھتے تھے۔ اور بیٹھے بیٹھے آپ نے فرمایا:۔

"ھُمُ الاَخسَرُونَ" (وہ لوگ سخت خسارے میں ہیں) حضرت ابوذرؓ نے پوچھا "کون یا رسول اللہ؟" فرمایا جو لوگ مال و دولت کے انبار جمع کرتے رہتے ہیں۔ اور پھر اس کو (آپ نے اپنے ہاتھوں سے چاروں طرف کو پھینکنے کا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) یوں اور یوں خرچ نہیں کرتے۔ یہ ہے "حقاً سِوَی الزَّکوٰۃ" کی حقیقت۔ اہلِ دولت زکوٰۃ

دینے کے بعد فارغ نہیں ہو جاتے۔ بلکہ اسلامی نظامِ حکومت، اسلامی سوسائٹی اور افرادِ مسلم کی بے شمار ضروریات ان سے ہر وقت مطالبہ کرتی ہیں۔ کہ اَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا!

احادیث تو یہاں تک لے جاتی ہیں کہ قیامت کے روز خدا تعالیٰ اپنے بندوں سے کہے گا میں جب ضرورت مند بن کر تمہارے پاس پہنچا۔ تو تم نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ بندے تعجب سے پوچھیں گے کہ اے اللہ تو کیسے ضرورتمند ہو سکتا ہے؟ خدا فرمائے گا کہ میرا فلاں فلاں بندہ چونکہ میرا بھیجا ہوا تھا۔ لہٰذا تم نے اس سے جو سلوک کیا۔ وہ مجھی سے کیا تھا، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسلامی حکومت کا سوسائٹی اور افرادِ مسلم کی ہر ضرورت کا مطالبہ درا صل براہِ راست اللہ تعالیٰ کا مطالبہ ہے۔ اور ان مطالبات کے جواب میں زکوٰۃ دے دینا ہرگز کافی نہیں ہو سکتا۔

اَنفاقِ اَلعَفو

انفاق کے مطالبات کی وُسعت کے پیشِ نظر صحابہ کی سوسائٹی میں یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا خرچ کیا جائے۔ اور کتنا خرچ کیا جائے؟ اسی سوال کو قرآن نے دوہرایا کہ:-

"یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ" (لوگ پُوچھتے ہیں۔ کہ کیا خرچ کریں؟)"قُلِ الْعَفْوَ" (جواب میں کہہ دیجئے۔ کہ "العفو")۔ العفو، بچتوں اور فاضلات کو کہتے ہیں، اور انفاقِ العفو سے مراد یہ ہے کہ ایک مسلمان کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد کی بچتوں اور فاضلات کو خدا کی راہ میں اس وقت تک صرف کرنا چاہئے۔ جب تک کہ اُن کے مصرف موجود ہوں۔

یہ چیز مسلم ذہنیّت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی کہ اسلامی حکومت کا خزانہ دم توڑ رہا ہو۔ یا سوسائٹی کی ضروریات اٹکی ہوئی ہوں۔ یا مسلمان بیوائیں اور یتیم بچّے اور مزدور پیشہ مساکین فاقہ اور بیماری میں مبتلا ہوں۔ اور دوسری طرف روپیہ بچا بچا کے رکھا جا رہا ہو۔ یہی وہ بخل ہے جس کے طوقِ گلو بننے کی وعید سنائی گئی ہے۔

پھر "العفو" کا دائرہ روپے، پیسے، غلّے اور استعمالی اشیاء ہی تک وسیع نہیں ہے، بلکہ اگر کسی شخص کے پاس وقت فاضل ہے۔ دماغی یا جسمانی قوت فاضل ہے تو اس کو اسی کا انفاق کرنا چاہئے چنانچہ نبی صلعم نے فرمایا۔ کہ صدقہ ہر مسلم پر واجب ہے (مسلم و بخاری)، پوچھا گیا۔

کہ اگر کسی کے پاس کچھ مال ہی نہ ہو تو وہ کیا کرے؟ فرمایا۔ ہاتھ سے محنت کر کے اپنے آپ کو بھی اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچائے۔ پھر سوال ہوا۔ کہ اگر وہ محنت کی طاقت نہ رکھتا ہو تو پھر؟ فرمایا محتاج اور مظلوم کی ممکن امداد کرے۔ پوچھا گیا۔ کہ اگر یہ بات بھی استطاعت سے باہر ہو تو؟ فرمایا۔ نیکی کی نصیحت ہی کرتا رہے۔ پھر پوچھا گیا۔ کہ اگر یہ بھی نہ کر سکے تو؟ فرمایا۔ دوسروں کو شر پہنچانے سے باز رہے تو یہ بھی ایک طرح کا صدقہ ہے ــــ یہاں تک کہ نبی صلعم نے صدقہ کی اصطلاح کو اتنی وسعت دی ہے کہ راستے سے کانٹا ہٹا دینا صدقہ ہے۔ کسی کا بوجھ اُٹھوا دینا صدقہ ہے، راستہ بتانا صدقہ ہے۔ صلح کرانا صدقہ ہے۔ مسلمان سے خندہ رُوئی سے پیش آنا صدقہ ہے۔ مدعا یہ کہ مال، وقت اور قوت میں سے جو کچھ بھی "اَلعَفوُ" کی تعریف میں آجائے، اس میں سے جو رقم بھی خدا کی خوشنودی کے لئے بندوں کی خدمت میں صرف کی جائے گی۔ وہ صدقہ ہو گی ــــ اور صدقہ اسی وسیع تصوّر کے ساتھ ہر مسلمان کے لئے لازم کیا گیا ہے۔

صدقہ کی وسعت کا تصوّر دلانے کے لئے ایک اور حدیث کا

حوالہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جسے ترمذی کے علاوہ صحاح ستہ کی ساری کتابوں میں لیا گیا ہے۔ روایت یوں ہے کہ ایک اعرابی نے آنحضور صلعم سے سوال کیا۔ کہ مجھے ہجرت کا مسئلہ بتایئے۔ آپ نے فرمایا تیرا بھلا ہو وہ تو بہت دشوار کام ہے۔ یہ بتا کہ کیا تیرے پاس کوئی اونٹ ہے؟ اعرابی نے عرض کیا، جی ہاں اونٹ تو ہیں۔ فرمایا کیا تو ان میں سے صدقہ زکوٰۃ دیتا ہے؟ اُس نے عرض کیا، جی دیتا ہوں۔ پھر پوچھا۔ کیا ان میں سے دُودھ پینے کے لئے کسی کو عاریتہً کوئی اونٹنی کبھی دیتے ہو؟ وہ بولا جی ہاں دیتا ہوں۔ پھر دریافت فرمایا۔ کہ کیا گھاٹ پر جانے کے دن مسکینوں کو دُودھ بانٹتے ہو؟ اُس نے اثبات میں جواب دیا۔ فرمایا یہی طرزِ عمل جاری رکھ۔ خدا تعالیٰ تیرے عمل صالح میں سے کوئی چیز ضائع نہ ہونے دیگا۔

اس روایت سے واضح ہوتا ہے۔ کہ صرف صدقۂ زکوٰۃ کی ادائی ہی کا مطالبہ نہیں، بلکہ اپنے اموال اور ذرائع و وسائل کے ذریعے ہر طرح کی خدمات عامہ انجام دیتے رہنا مطلوب ہے۔ جس نبیؐ نے اُمت سے یہ چاہا کہ:۔

لَا تَمْنَعُوْا فَضْلَ الْمَآءِ لِتَمْنَعُوْا بِهٖ الْكَلَأَ — زائد پانی کو نہ روکو، کیونکہ اس طرح تم نباتات کی روئیدگی کو روکتے ہو۔

وہ کیسے پسند کر سکتا ہے۔ کہ دولت، ذرائع و وسائل اور قوائے کارکردگی میں سے "العفو" کو روک کر رکھا جائے۔ اور اس طرح آدمی سوسائٹی کی ضروریات کے پورا ہونے میں رکاوٹ پیدا کرے۔

ماعون دینا صدقہ کی ایک قسم گھریلو استعمال کے آلات مثلاً ترازو باٹ، چھلنی چھاج، کلہاڑی کدال وغیرہ کو مستعار دینا ہے۔ انہی چیزوں کو "ماعون" کہا گیا ہے۔ اور ان کے بارے میں بخل کرنے کو سورۂ ماعون میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ ایک اسلامی سوسائٹی میں استعمالی اشیاء کو ایک دوسرے کی ضروریات پوری کرنے کے لئے مستعار دینے کا جذبۂ عام جب بر سرِ عمل ہو تو غریب گھرانوں کے بہت سے کام اس جذبے کی وجہ سے چل جاتے ہیں، لیکن ایک ایسی سوسائٹی جس میں عاریت کے طور پر استعمالی اشیاء کے لین دین میں رکاوٹیں پیدا ہو جائیں اور جس میں جذبۂ اخوت مر جاتے اور ہر شخص اور ہر گھر اپنی تمام ضروریات کو خود اپنے ہی بل بوتے پر پورا کرنے پر مجبور ہو،

تو ایسی سوسائٹی میں معاشی کشمکش بڑھ جاتی ہے۔ اسی کا سدِّ باب کرنے کے لئے براہِ راست قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے استعمالی اشیاء کو عاریتہً لینے دینے کی ترغیب دلائی ہے۔

اسلامی اخلاقیات اور سرمایہ داری

اب آپ خود غور کیجئے۔ کہ اگر کسی آبادی کے اکثر افراد میں یہ اسلامی اخلاق پایا جاتا ہو کہ وہ دولت پرستی کے بجائے ایک اُونچے اخلاقی نصب العین کے لئے ہمہ تن وقف ہوں۔ ان کی نگاہیں رزقِ کفاف پر مرتکز ہوں، وہ دونوں ہاتھوں سے انفاق کرتے ہوں، وہ "العفو" کو دوسروں کی اجتماعی اور انفرادی ضروریات میں صرف کرتے ہوں، وہ باہم "ماعون" دیتے ہوں، وہ کاروبار میں اخلاقی حدود کے پابند ہوں تو یہ بات کس طرح ممکن ہے کہ اُن میں سرمایہ داری فروغ پائے۔

کہا جاسکتا ہے کہ یہ اسلامی اخلاقیات آج کہاں ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب اسلامی سوسائٹی کا نظم ہی کئی صدیوں سے درہم برہم چلا آرہا ہے۔ اور سرے سے عقائد اور عبادات اساسی ہی برقرار نہیں رہے تو ان عقاید و عبادات پر استوار ہونے والے

اخلاقیات کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے۔ جو سیلاب پورے اسلامی نظام کو بہالے گیا ہے اس کی موجیں اسلام کے اخلاقی تقاضوں کو بھی بہا لے گئی ہیں۔ پس آج اگر عقاید و عبادات کو بحال کرنے کے لئے کوئی مہم شروع کی جانی چاہئے۔ تو یقیناً اسلام کے ان اخلاقی تقاضوں کو قائم کرنے کے لئے بھی ایک منظم جدوجہد ہونی چاہئے، لیکن پھر اس پر کہا جاتا ہے کہ اس اخلاق کے افسانے تو کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کو قائم کرنا ممکن نہیں ہے۔ مایوسی کا یہ رجحان اسلام کے ہوشیار مخالفین نے پیدا کیا ہے کہ کوئی ان سے پوچھے کہ اگر حکومت اور سوسائٹی جمہوریت کے نظام کا مطلوبہ اخلاق پیدا کرنے کے پروگرام بنا سکتی ہے اگر تعلیم اور نشر و اشاعت کے ذرائع مادہ پرستانہ اخلاقیات کو فروغ دے سکتے ہیں۔ تو خاص اسلام ہی کے اخلاقیات کی بحالی کے لئے وہ کیوں بیکار ہیں، یا تو یہ کہئے کہ کسی طرح کا اخلاق بھی تبلیغ و تعلیم اور تربیت کے ذریعے انسانوں میں پیدا نہیں کیا جا سکتا اور یا پھر یہ تسلیم کیجئے کہ اگر کوئی غیر اسلامی اخلاق پیدا کیا جا سکتا ہے تو اسلامی اخلاق بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ یہ اسلام کے لئے یک طرفہ مایوسی کیوں۔ اس اخلاق کو

اسلام عرب کے اَن پڑھ بدّوؤں میں پیدا کر کے دکھا چکا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ اُسے وہ آج کے ذہین اور تعلیم یافتہ انسانوں میں پیدا نہ کر سکے جب کہ آج اسے اعلیٰ سے اعلیٰ ذرائع و وسائل میسّر آسکتے ہیں۔

ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ایک صالح قیادت برسرِ عمل ہو اور وہ حکومت کی زمام کار ہاتھ میں لینے کے بعد اس کی ساری قوتوں کو رضائے الٰہی کے مطابق استعمال کرنے کا آغاز کر دے۔

۳۔ صالح معاشرہ کی تشکیل

اسلام افراد میں اخلاق کی تعمیر کرنے کے بعد ان کو حالت انتشار میں نہیں چھوڑ دیتا، بلکہ وہ ان اینٹوں کو جوڑ کر معاشرہ کا ایک ایسا قلعہ تعمیر کرتا ہے۔ جس میں کسی معاشی فساد کے لئے داخل ہونا آسان نہ ہو۔ اور جس کی فضا میں معاشی امن پوری طرح نشوونما پا سکے۔ انفرادی اخلاق یقیناً ایک قابلِ قدر نعمت ہے، لیکن اگر اس اخلاق کے تقاضوں کے مطابق معاشرہ کا ماحول تشکیل نہ پائے۔ تو انفرادی اخلاق آہستہ آہستہ سوکھ جاتا ہے۔ اسلامی نظام حیات کے تحت جہاں افراد میں ایک خاص طرز کی سیرت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہاں اسی سیرت کے

مطابق ایک صالح سوسائٹی بھی وجود میں لائی جاتی ہے۔ صالح سوسائٹی کی فضا میں افراد کی سیرت کے جوہر پوری طرح کھلتے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے کھلتے ہیں جس تناسب سے کہ معاشرہ کی اجتماعی فضا کو اسلام کے منشا پر ڈھالا گیا ہو۔

معاشی نقطۂ نظر سے اسلام اپنے اصولوں پر تعمیر کئے ہوئے معاشرے میں افراد کے درمیان ایسی وابستگی اور قرابت داری چاہتا ہے کہ جس کے زیر اثر وہ ایک دوسرے سے تعاون کرنے والے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہوں۔ سرمایہ دارانہ نظام معاشیات کے تحت ہر فرد انسانی دوسروں سے کچھ کما لینے کو اپنا کمال سمجھتا ہے اور اپنی کمائی میں اپنی خواہشات کے حقوق کے سوا دوسروں کے حقوق کا احساس نہیں رکھتا۔ بخلاف اس کے اسلام اپنے معاشرہ میں یہ چاہتا ہے کہ دوسروں سے کمایا ہی نہ جائے بلکہ دوسروں پر خرچ بھی کیا جائے دوسروں سے نفع اٹھایا ہی نہ جائے، انہیں نفع پہنچایا بھی جائے، نیز اسلام اپنی سوسائٹی کے ہر فرد کو دوسرے افراد کے گوناگوں حقوق کا احساس دلاتا ہے۔ ایک مسلم اپنی ضروریات نفس ہی کا ذمہ دار نہیں ہے

بلکہ وہ اپنے ساتھ مختلف قسم کے تعلقات رکھنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے متعلق بھی بہت سی ذمّہ داریوں کا بوجھ اٹھانے پر مجبور ہے۔

یہ احساسِ حقوق اور شعورِ ذمّہ داری جو اسلام اپنے معاشرہ کے ہر فرد میں بیدار کر دینا چاہتا ہے اس کے ذریعے تعاون و اخوّت کی ایسی فضا تشکیل پاتی ہے جس میں طبقاتی تقسیم اور طبقاتی انتفاع اور طبقاتی تصادم کے پیدا ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں۔

یہاں ان حقوق کی چند اصولی اقسام بیان کی جاتی ہیں۔ جو اسلامی معاشرہ کے تحت ہر فردِ مسلم کے پیشِ نظر رہتے ہیں۔

حقوقِ نفس

حقوق کی تقسیم کا سوال جونہی چھڑا، سب سے پہلے ایک فرد کی اپنی ہستی سامنے آتی ہے۔ چنانچہ نبی صلعم فرماتے ہیں کہ ولنفسك[۱] علیك حق۔ یعنی آدمی کے اوپر خود اپنے نفس کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ ان حقوق سے اسلام نے رہبانیت کی طرح روگردانی نہیں کی بلکہ ان کو تسلیم کیا ہے اور ان کے لئے اپنے نظامِ فکر و عمل میں باقاعدہ جگہ نکالی ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ جب تک انسان اپنے نفس کے حقوق کانٹے کے تول پورے کر کے ادا نہیں کرتا، وہ دوسروں کے حقوق ادا

---

[۱] مشکوٰۃ میں ہے "ولجسدك علیك حق"

کرنے میں ہمیشہ افراط و تفریط سے کام لیتا رہا ہے۔

ایک فردِ مسلم کو بہر حال اپنی کمائی کے بل پر شرعاً ایک صاف ستھری زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس سے یہ چاہا گیا ہے کہ وہ محنت کے مطابق اپنے نفس کو آرام بھی پہنچائے۔ وہ صفائی ستھرائی سلیقہ اور ذوق کا اہتمام بھی کرے، وہ اپنی بود و ماند ایسی رکھے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمت کا شکر آمیز اظہار ہو۔ لیکن دو مفاسد سے پرہیز لازم ہے۔ ایک یہ کہ نفس کے تقاضوں کو اسراف کی حد تک نہ پہنچنے دے۔ دوسرے یہ کہ نفس کو کبر کے مظاہرے کا حق نہ دے ورنہ یہ دونوں مفاسد اس کی سیرت کو اسلام کی بنیادوں سے ہٹا کر رہیں گے۔ اور ان کا نتیجہ آخرت میں بہر حال دوزخ ہے۔

حقوقِ والدین

ایک فردِ مسلم کے لئے اپنے نفس سے باہر کی دنیا میں اسلام نے حقوق کا سب سے زیادہ بڑا بوجھ اگر کسی کا بتایا ہے تو وہ والدین کے حقوق کا بوجھ ہے۔ سوال ادب و اطاعت ہی کے انتہائی اہتمام کا نہیں بلکہ معاشی طور پر بھی والدین کی پوری پوری خدمت انجام دینے کی ذمہ داری اولاد پر عاید ہوتی ہے۔ دنیا کا یہ وہ

اہم ترین رشتہ ہے جس کے حقوق کو پہچاننے سے انسانی زندگی کے سارے حقوق کا شعور ہوتا ہے۔ باپ کی شفقت اور ماں کی محبّت کی قدر اگر کسی کے دل میں پیدا نہ ہو سکے۔ تو پھر نہ وہ خدا تعالیٰ کی بخششوں کا قدردان ہو سکتا ہے، نہ دوسرے ابنائے نوع کے حقوق کا اسے کوئی احساس ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے حقوق کے بعد مخلوق میں سے اسلام نے والدین کے حق کو سب سے زیادہ اہمیّت دی ہے۔ معاشی نقطۂ نظر سے اسلام نے اخلاقی حد تک ہی نہیں، بلکہ قانونی طور پر والدین کو اولاد اور اس کے سارے اموال و املاک کا مالک ٹھہرایا ہے۔ اور انہیں حق دیا ہے کہ اولاد کے اموال میں جو تصرّف چاہیں کریں۔

حقوقِ اہل و عیال

حقوقِ والدین کے بعد دوسرا درجہ اہل و عیال کے حقوق کا ہے بیوی بچّوں کا نان و نفقہ یعنی ان کی معاشی ضروریات کا پورا کرنا اسلام کے قانون کی رُو سے واجب ہے ہی۔ لیکن اگر یہ حق خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے اور اس کی ہدایت کے مطابق ادا کیا جائے تو ہر وہ کوڑی عند اللہ صدقہ شمار ہوتی ہے، جو کسی شخص نے اپنے اہل و عیال پر خرچ کی ہو۔ اپنے اہل و عیال کی

جائز ضروریات پوری کرنے کے لئے جائز ذرائع سے جو کوشش کی جائے وہ قطعی طور پر عبادت کی تعریف میں داخل ہے۔ پھر اسلام نے اپنی روح مساوات کو قائم رکھنے کے لئے یہ چاہا ہے کہ ایک مسلم اپنے اہل وعیال پر اپنی آمدنی کے مطابق صرف کرے اور بیوی بچوں کو وہی کچھ کھلائے اور پہنائے جو کچھ کہ وہ کھاتا پہنتا ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر سفارش یہاں تک کی گئی ہے۔ کہ ایک آدمی اپنے متعدد بچوں پر مال صرف کرنے میں تفریق نہ کرے، ورنہ ان میں اخلاقی مفاسد پیدا ہوں گے۔

حقوق اہل وعیال کے بارے میں احادیث سے یہاں تک اشارات ملتے ہیں کہ اپنے زیر کفالت افراد کی حقیقی ضروریات کو نظر انداز کر کے جو انفاق باہر کیا جاتا ہے اس میں اہل وعیال کی حق ماری پائی جاتی ہے، چنانچہ نبی صلعم نے متعدد مواقع پر اپنے زیر تربیت صحابیوں کو یہ تلقین فرمائی۔ کہ جاؤ اور اپنے اہل وعیال پر مال صرف کرو۔ تمہارے لئے صدقہ یہی ہے۔ اور تمہارے انفاق کے اوّلین مستحق تمہارے بیوی بچے ہیں۔

بیوی بچّوں کو خستہ حال چھوڑ کر اگر کوئی شخص روپیہ جمع کرتا ہے، یا اپنی ذاتی دلچسپیوں پر بے تحاشا اپنی کمائی صرف کرتا ہے، اور اپنی خوش پوشی اور خوش حالی کا مظاہرہ کرتا پھرتا ہے۔ یا گھر والوں کو بھوکا چھوڑ کر باہر داد و دہش کر رہا ہے تو اس کی روش اسلام کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہے۔

حقوق ذوی القربیٰ

والدین اور اہل و عیال کے بعد قرآن اور حدیث دونوں میں ذوالقربیٰ کے حقوق کو اتنی اہمیّت دی گئی ہے کہ ایک مسلم ان سے چشم پوشی کر کے اپنی عاقبت کے متعلق کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔ قرابت داروں کا یہ شرعی حق ہے کہ ایک طرف مسلمان ان کے ایمان و اخلاق کے نشو و نما کے لئے جو کچھ کر سکتا ہو، کرے، اور دوسری طرف وہ معاشی پہلو سے جس حد تک امداد کے محتاج ہوں، اُن کو امداد بہم پہنچاتے۔

نبی صلعم کے لئے خمس و فئے کا جو حصّہ اسلامی اسٹیٹ کی طرف سے اللہ تعالیٰ نے مقرّر فرمایا تھا اس کے ساتھ آپ کے ذوی القربیٰ کا حق بھی شامل کیا تھا۔ چنانچہ نبی صلعم نے اس حق کو عمر بھر اس طرح ادا

کیا کہ بالفاظ کتاب الخراج آنحضور اسی مال سے بنو ہاشم کے کنواروں کی شادیاں کرتے تھے مقروضوں کے قرض ادا کرتے تھے اور فقرا کو بقدر ضرورت عطا کرتے تھے۔ آپ کے اسوہ کے مطابق آپکے ہر امتی کیلئے لازم ہے کہ اس کی آمدنی جہاں تک کفایت کرے اپنے رشتہ داروں کی معاشی ضروریات میں ان کا معاون ثابت ہو ۔۔۔ اگر کسی سوسائٹی میں حقوق ذوی القربیٰ کا احترام پایا جاتا ہو تو ظاہر ہے کہ ایک ضرورتمند شخص کو اپنے رشتہ داروں کے وسیع حلقے میں سے کسی نہ کسی طرف سے مشکل وقت میں امداد بہم پہنچ سکتی ہے۔

حق الجار ذوی القربیٰ کے بعد پڑوسی کے حقوق پہ زور دیا گیا ہے انجیل میں دین کے تصوّر کو ان الفاظ میں سمیٹا گیا ہے کہ "تو اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور ساری جان کے ساتھ محبت رکھ اور اپنے پڑوسی کی خدمت کر" یہ جملہ حقوق اللہ کے بعد حقوق العباد کا جو تصوّر دلاتا ہے اس میں پڑوسی کے حق کی اہمیّت واضح کی گئی ہے۔ احادیث میں ہر مسلمان سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں کے جان، مال اور آبرو کا پورا محافظ ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ ترغیب دی گئی ہے کہ اگر گھر میں کوئی نعمت آئے تو اس کا ایک حصّہ پڑوسی کے بچّوں کے لئے بھی بھیجا جائے۔ سالن پکے

تو پڑوسی کو ہدیہ کرنے کے لئے اس میں گنجائش رکھنی چاہیئے۔ پھر ایک حدیث ہم کو یہاں تک لے جاتی ہے کہ اس شخص کا ایمان مشتبہ ہے جس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا لیکن اس کا پڑوسی فاقہ میں مبتلا رہا۔

پڑوس کا یہ معاشی حق اصلاً تو دیوار بیچ کے ہمسایوں کے لئے مخصوص ہے لیکن اس سے محلّے اور شہر اور ملک کے ضرورتمندوں کی خدمت کی ذمّہ داری کا اشارہ از خود اخذ ہوتا ہے۔ پھر پڑوس سکونت ہی کا نہیں، کاروباری قرابت کا پڑوس بھی ہوتا ہے۔ ایک بازار کے دوکاندار، ایک دفتر کے ملازم ایک کارخانے کے کارندے ایک گاؤں کے زمیندار اور دہقان باہم پڑوس کا حق بدرجۂ اُولےٰ رکھتے ہیں۔

یہ حق الجار جس کا شعور و احساس مر جانے کی وجہ سے سرمایہ داری کو نشو و نما پانے میں سہولت حاصل ہوگئی ہے۔ اس کو اگر تعمیر معاشرہ میں پوری اہمیّت دی جائے تو موجودہ ناہمواریوں پر کافی کاری ضرب پڑ سکتی ہے۔

حقوق عامۃ المسلمین | یہ تو خاص قسم کے حقوق ہیں جن کے تقاضے

بہت وسیع ہیں۔ اسلامی معاشرہ میں ایک عام مسلمان کے دوسرے مسلمانوں پر جو حقوق واجب کئے گئے ہیں اگر صرف انہی کو لے کے دیکھا جائے تو یہ تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ان حقوق کے احترام کے ساتھ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کے طور طریقے بحال رہ سکتے ہیں ایک مسلم کے دوسرے مسلمانوں پر کم سے کم یہ حقوق ہیں:۔

(۱) اس کی جان، مال، آبرو کی حفاظت کی جائے (۲) وہ جب ملے اس پر سلام بھیجکر اس کی سلامتی کی دُعا کی جائے (۳) اس سے برابر کا برتاؤ کیا جائے (۴) ہمیشہ اس کی بھلائی چاہی جائے (۵) اس کو معروف کی نصیحت کی جائے اور اسے منکر سے روکا جائے (۶)، اسے چھینک آئے تو اس کے لئے خدا سے رحم کی دُعا کی جائے (۷)، وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت کی جائے (۸) اس کے جنازے کے ساتھ مشایعت کی جائے اور اس کے لئے مغفرت کی دعا کی جائے (۹) اس کے ہاں موت واقع ہو جائے تو تعزیت کی جائے (۱۰) اسے تحفہ اور ہدیہ دیا جائے (۱۱) وہ دعوت دے۔ تو بخوشی قبول کی جائے (۱۲) وہ گھر آئے۔ تو اسے برابر کی نشست

پر بٹھایا جائے۔ (۱۳) وہ کھانے کے وقت حاضر ہو تو اسے دسترخوان پر دعوت دی جائے (۱۴) وہ مہمان یا مسافر ہو تو کم سے کم تین دن تک اس کی پوری تواضع کی جائے (۱۵) وہ مشورہ طلب کرے تو اسے نیک مشورہ دیا جائے (۱۶) وہ سائل بن کر آئے تو اس کی ضرورت پوری کر دی جائے ورنہ نرمی سے معذرت کر دی جائے۔ (۱۷) وہ قرض کا طالب ہو تو اسے قرض حسنہ دیا جائے (۱۸) وہ کسی چیز کا سودا کر رہا ہو تو اس میں مداخلت نہ کی جائے۔ (۱۹) وہ کسی عورت کو نکاح کا پیغام بھیجے تو اس کے مقابلے پر نکاح کا پیغام نہ بھیجا جائے (۲۰) اس کے خلاف بدگمانی نہ کی جائے، بلکہ حسنِ ظن سے کام لیا جائے (۲۱) اس کی غیبت نہ کی جائے (۲۲) جہاں تک ہو سکے اس کی غلطیوں کو معاف کیا جائے (۲۳) وہ ظالم ہو تو اسے ظلم سے روکا جائے۔ اور مظلوم ہو تو اسے ظلم سے بچایا جائے (۲۴) وہ کسی سے رنجیدہ ہو تو مصالحت کرا دی جائے (۲۵) اس سے تین روز سے زائد مدت تک قطع تعلق نہ کیا جائے۔ وغیرہ!

ان سارے حقوق کو سامنے رکھ کر سوچئے اور فیصلہ کیجئے کہ

یہ حقوق اگر کسی سوسائٹی میں ادا کئے جا رہے ہوں تو کیا وہاں یہ ممکن ہے کہ گروہ بندیاں اور طبقہ بندیاں پیدا ہوں اور ایک طرف سے اکڑ اور کبر کا رویہ پیش کیا جائے اور دوسری طرف سے بندگی اور غلامی کا مظاہرہ کرنے پر لوگ مجبور ہوں! یا کیا یہ ممکن ہے کہ "کسے را باکسے کارے نباشد" کی کیفیت نمودار ہو؟ ہماری موجودہ سوسائٹی تیزی سے سرمایہ دارانہ نظام کی طبقہ بندیوں کی طرف اسی لئے بڑھ رہی ہے کہ اس میں حقوق مسلم کا وہ احترام باقی نہیں رہا۔ جو ایک نظام اخوت و مساوات پیدا کرتا ہے اور معاشی ناہمواریوں کو ناقابل برداشت حالت تک پھیلنے نہیں دیتا آج اگر ہمارے کارخانوں کے مالک اور زمیندار لوگوں میں ادائے فرض کا احساس بیدار ہو جائے۔ اور وہ اپنے اجیروں کے سچے خیر اندیش، ان پر شفقت کرنیوالے، ان کی مصیبتوں میں حصہ لینے والے، ان کی خبر گیری کرنے والے اور ان کو مساویانہ عزت کا حق دینے والے بن جائیں تو سرمایہ دارانہ نظام کی معاشی ناہمواریوں کے اثرات بد کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ہمارے کسان اور مزدور کی

صرف اُجرت ہی نہیں ماری جا رہی، بلکہ اس کے وہ مجلسی حقوق بھی مارے جا رہے ہیں جو اسلام نے اُسے دیئے تھے۔ اور اس وجہ سے صورت حالات ناگوار تر ہو گئی ہے۔

فاقہ صرف روٹی ہی کا درپیش نہیں، بلکہ عزت و وقار کا فاقہ بھی درپیش ہے۔ اور ہمارے غربا صرف پیٹ ہی کے بھوکے نہیں ہیں، بلکہ دل و دماغ اور روح کے بھی بھوکے ہیں۔ یہاں قحط صرف سکوں ہی کا درپیش نہیں ہے، بلکہ اخوت و مساوات کے مظاہر کا بھی کال ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا خاصہ ہے کہ یہ امرا اور غربا میں معاشی ہی نہیں، مجلسی اور اخلاقی دوری بھی پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ اس نظام کے تقاضوں نے نماز کی اجتماعی صف بندیوں سے امراء کو بالکل الگ کر دیا ہے۔ زندگی کے کسی گوشے میں امیر اور غریب کا شانے سے شانہ ملا کر کھڑے ہونا ممکن نہیں رہا۔ دونوں طبقوں کی مجلسیں الگ ہو چکی ہیں، دونوں کی تہذیبیں الگ ہو چکی ہیں، دونوں کے محلے الگ ہو رہے ہیں، گاڑیوں میں دونوں کی نشستیں جدا جدا ہیں۔ اور قبرستانوں تک میں دونوں کی قبروں کا نقشہ ایک دوسرے سے ممتاز ہوتا ہے۔ وہ "اخوت اسلامی" جس کے

بارے میں نبی صلعم کو اللہ تعالیٰ نے اپنا احسان جتاتے ہوئے یہ کہا تھا، کہ اسلام کا یہ ایسا اعجاز ہے۔ کہ اگر تم اسے پیدا کرنے کے لئے دولت کے انبار بھی صرف کر دیتے تو کامیاب نہ ہو سکتے، اس کا پوری طرح تیا پانچہ ہو چکا ہے۔ اس اخوت کو بحال کرنے کا طریقہ یہ نہیں کہ دونوں طبقوں کی جُداگانہ مورچہ بندیاں قائم کر کے معرکۂ پیکار گرم کیا جائے؛ بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ سوسائٹی کو "حقوقِ مسلم" کی بنیادوں پر دوبارہ اُستوار کیا جائے۔ حقوقِ مسلم کا اہتمام دونوں طبقات کے افراد کو از سرِ نو ایک صف میں لا کھڑا کرے گا۔

وہ اسلامی سوسائٹی جس کے ایک ضرورت مند فرد کے بارے میں سب سے پہلے اس کے ذوی القربیٰ کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہو، پھر اس کے پڑوسیوں کو اس کی خدمت کے لئے مامور کیا گیا ہو؛ پھر اسلامی جماعت کے ہر رکن سے اس کی اعانت کا مطالبہ کیا گیا ہو، کیسے ممکن ہے، کہ اس میں معاشی احتیاجیں موجود رہیں۔ اور کوئی اُن کی خبر گیری نہ کرے۔

ایک مایوسانہ اعتراض

کہا جائیگا کہ ایسے صالح معاشرہ کا خواب کیسے تعبیر دکھا سکتا ہے۔ اور اس امر کی کیا

ضمانت ہے کہ امراء اپنے فرائض کو ادا کریں گے؟ اس کے جواب میں میں یہ عرض کروں گا کہ اسلامی سوسائٹی بنانے کے لئے اگر ۵ سال تک اس کے افراد میں اسلامی عقاید کی آبیاری کی جائے، اسلامی عبادات کو از سرِ نو قائم کر کے انہیں اسلام کے معاشی اخلاق کی تربیت دی جائے۔ پھر حکومت پورے وسائل کے ساتھ اہل و عیال، ذوی القربیٰ، پڑوس اور عامۃ المسلمین کے حقوق کا احترام پیدا کرنے کی جدوجہد کرے، یہاں تک کہ ہمارے معاشرتی ماحول میں نئی روایات پیدا ہو جائیں۔ اور ایک رائے عام اسلام کے اخلاقی تقاضوں کی حفاظت کے لئے بیدار ہو جائے، تو بہرحال یہ ناممکن ہے کہ موجودہ تفریق و تقسیم برقرار رہ سکے۔ اسلامی معاشرہ کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کے مطالبات کو پورا نہ کرنے والے خوش حال لوگوں کے خلاف، جو صرف اپنی انفرادی لذات کے پیچھے پڑے رہیں ایک جذبۂ نفرت کو بیدار کیا جائے۔ اور ایسے لوگوں کے لئے حکومت اور سوسائٹی کے مختلف میدانوں میں ترقی کرنے کے راستے بند کر دیئے جائیں۔ دولت معیارِ عزت نہ رہے۔ بلکہ فرض شناسی اور اخلاق معیارِ عزت ہو۔ سوال یہ ہے کہ جیسے آج ایک گالیاں بکنے والے

ایک نظر باز، اور ایک فقرے کسنے والے کے لئے اگرچہ کوئی قانون فوجداری مزاحم نہیں ہے، لیکن بہرحال کسی مہذب سوسائٹی کے افراد ایسے لوگوں سے دوستی اور مجلس آرائی رکھنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ ان کے پڑوسی بننے سے بچنا چاہتے ہیں۔ اور ان کے اثرات سے اپنے بچوں کو بچانا چاہتے ہیں، اور کسی کارِ خیر کے لئے ان کو منتخب کرنے پر تیار نہیں ہوتے، اور اس طرح انسانیت کے ایک گھٹیا نمونے کو پنپنے سے روک سکتے ہیں، تو کیا وجہ ہے کہ اسی طرح ہم اپنے ان امراء کے طرزِ عمل کو نشو ونما پانے سے نہ روک دیں جو اسلامی سوسائٹی کے اعلیٰ اخلاقی مطالبات سے غافل ہو کر محض اپنی دولت میں مگن رہنا چاہیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف نہ صرف رائے عامہ ایک تازیانے کا کام دے گی، بلکہ اسلامی نظامِ تعلیم خود ان کے بچوں کو ان کے طرزِ عمل کے خلاف معرکہ آرا کر کے رہے گا۔ ایک سوسائٹی اگر اسلامی اخلاق کے تقاضوں کی حفاظت پر تُل جاتے تو اس کی فضا میں اُن تقاضوں سے تغافل کرنے والوں کے لئے جینا محال ہو جاتا ہے۔ موجودہ نسل کے کچھ امراء اگر اپنی عاداتِ بد کے بندھنوں سے پوری طرح آزاد نہ بھی ہو سکیں تو بھی بہرحال

آئندہ نسل کو نئے نقشے پر تیار کیا جا سکتا ہے۔

خود دورِ نبوی میں ایسے منافقین موجود تھے جو اسلامی معاشرہ کے اخلاقی تقاضوں سے ہمیشہ انحراف کرتے تھے۔ باہم ساز باز کرنا، خفیہ مشورے کرنا، اسلامی حکومت کی کارروائیوں کا مضحکہ اڑانا، اہم خبروں کو نشر کر دینا، دشمن کو راز بہم پہنچا دینا، مسلمانوں میں منافرت اور تصادم پیدا کرتے رہنا ان کے عام مشاغل تھے۔ ان مشاغل کو روکنے کے لئے کوئی قانونی کارروائی نہیں کی گئی، بلکہ صرف صالح رائے عامہ کو ان کے استیصال کے لئے استعمال کیا گیا، چنانچہ ان کے لئے مسلم سوسائٹی میں کوئی عزت نہ تھی اور نہ انہیں کبھی اجتماعی ذمہ داریوں اور خدمتوں کے لئے منتخب کیا گیا۔ بعینہٖ اسی طرح اگر ہمارے سرمایہ دارانہ مزاج کے کچھ امرا کسی طرح اسلامی اخلاق کو قبول کر کے نہ دیں تو ان کے لئے مسلم سوسائٹی میں عزت کا کوئی مقام نہ ہوگا۔ چاہے وہ کتنے ہی بڑے خزانوں کے سانپ بنے بیٹھے ہوں۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ کوئی اصلاحی اسکیم محض قانون کے دباؤ سے کامیاب نہیں ہو سکتی، لہٰذا اسلام جو قانونی نظام نافذ کرنا چاہتا ہے

اس کے قیام اور نفاذ اور استحکام کے لئے بھی یہ ناگزیر ہے کہ اس کی فطرت کے مطابق ایک معاشرہ تعمیر ہو۔ اس معاشرہ میں بالعموم تو رضا کارانہ طور پر اخلاقی تقاضوں کو پورا کرنے کا رجحان موجود ہونا چاہئے پھر جو چند سرکش افراد ان تقاضوں سے انحراف کرنا چاہیں۔ ان سے بالجبر دوسروں کے وہ کم سے کم حقوق وصول کر لئے جائیں۔ اور ان کم سے کم ذمہ داریوں کو پورا کرا لیا جائے جنہیں مسلم سوسائٹی کی فلاح اور اسلامی نظام اجتماعی کے استحکام اور امن و عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اسلام نے قانونی اہمیت دی ہے۔

۴۔ قانونی تدابیر

مذکورہ بالا اصلاحی تدابیر کی تکمیل کے لئے اسلام قانونی تدابیر بھی اختیار کرتا ہے، اور ہر نظام میں قانونی تدابیر کا پہلو موجود ہوتا ہے

قانونیات کی ماہیت

قانونیات کے متعلق یہ اصولی حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ یہ نہ تو معاشرہ کی اصلاح کرتی ہیں اور نہ تعمیرِ معاشرہ کا وسیلہ بنتی ہیں۔ قانون کا عمل اثباتی نہیں بلکہ منفی ہوتا ہے۔ وہ صالحیت کو پروان نہیں چڑھاتا اور

نہ مفسدات کو پیدا ہونے سے روک سکتا ہے، بلکہ اس کا اصل کام خرابیوں کے پیدا ہو جانے کے بعد ان کی روک تھام کرنا ہے۔ قانونیات کی حیثیت دواؤں کی سی ہے کہ مرض اور اس کی علامات کا مقابلہ کرنے کے لئے اُن سے مدد لی جاتی ہے، یا زیادہ سے زیادہ ان کے ذریعے حفظِ ما تقدم کا کچھ کام لیا جا سکتا ہے، لیکن صحت و قوت کا دار و مدار کبھی دواؤں پہ نہیں ہوتا۔ صحت و قوت کے لئے تو بہر حال غذا، صفائی، ورزش اور باقاعدگی وغیرہ اسباب کی ضرورت ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح افراد کی ذہنی و اخلاقی اصلاح اور صالح معاشرہ کی تعمیر قانون سے نہیں، بلکہ کسی اونچے نصب العین، اور اصُول و عقاید اور اخلاقی اقدار کے لئے مختلف ذرائع تعلیم و تربیت کو استعمال کرنے سے ہوتی ہے۔ قانون اخلاقیات کی اُگی ہوتی فصل کی باڑ تو بنتا ہے۔ لیکن محض باڑ لگانے سے فصل نہیں اُگا کرتی، بلکہ فصل اُگانے کے لئے تو ہل چلانے، سہاگہ پھیرنے، آبپاشی کرنے، بیج ڈالنے اور کھاد دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ قانون بُرے لوگوں کو بھلا نہیں بناتا، بلکہ بُروں کی برائی سے سوسائٹی کو بچاتا ہے۔

پس جو لوگ تمام تر قانونیات اور حکومت کی طاقت پر زور دیتے ہیں اور عقاید کی آبیاری اور اخلاق کی تعمیر کو اہمیت نہیں دیتے، وہ اس حکیم کی سی ذہنیت رکھتے ہیں جو صالح غذا، ورزش، صفائی، ستھرائی وغیرہ تدابیر کو بحالیٔ صحت کے لئے کوئی اہمیت نہ دے، بلکہ ان سب کے بجائے کچھ اپنی دواؤں کی پوٹلی کو پیش کر دے کہ یہ ہے خزانۂ صحت۔

زندگی کے معاملات پر اگر آپ غور کریں تو یہ حقیقت نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتی کہ سوسائٹی کے مختلف معاملات اس طرح طے نہیں پاتے کہ لوگ قانون کی کتابیں ہاتھ میں لئے پھرتے ہوں اور بات بات پر قانونی حوالے نکال نکال کر معاملات چکاتے ہوں، بلکہ معاملات تو اخلاقی احساسات ہی کے بل پر چلتے ہیں۔ قانون کی طرف توجہ اس وقت کی جاتی ہے جبکہ کوئی غیر معمولی صورتِ حالات نمودار ہو جائے۔ یہی نہیں، جس سوسائٹی کے اخلاق کی تعمیر نہ ہوئی ہو اس کے افراد قانون کے محل میں دن رات نقب زنی کرنے میں مصروف رہتے ہیں، تا آنکہ وہ احتساب کی گرفت میں آجائیں۔ روزمرہ کی عام زندگی پر عدالت کا اثر نہیں ہوتا۔ بلکہ سوسائٹی کے خصائل اور اخلاقی روایات کا قانون کارفرما ہوتا ہے

پھر قانون کو دنیا میں پوری طرح موم کی ناک بنا کے رکھ دیا گیا ہے اور ایک ہی قانونی نظام کے تحت متضاد فیصلے صادر ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ قانون کے ضمیر کو خرید آنک جا سکتا ہے۔

پس جب ہم ایک مسلم کے زاویۂ نگاہ سے غور کرتے ہیں تو صالح ذہنیّت اور صالح اخلاق کی اہمیّت پوری طرح ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ ہماری نگاہ میں سیاست، تمدن اور معاشرت کے مسائل ہوں یا معاشیات و اقتصادیات کے معاملات، ان کی صلاح و فلاح کا دار و مدار اصلاً ذہنیت و اخلاق کی درستی پر ہے، نہ کہ قانون کی سخت گیریوں پر[1]۔

---

[1] مادّی زاویۂ نگاہ رکھنے والوں کے نزدیک اخلاقیات کی کوئی خاص قدر نہیں ہے، وہ انسان کی طرف سے بہت بدظن ہیں اور اسے بہ جبر راہ راست پر لے چلنا چاہتے ہیں۔ قومی ملکیّت کا نظریّہ اس زاویۂ نگاہ سے انسان کو مطالعہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ مادہ پرست ذہنیّت نے جب نظامِ زندگی کے لئے نیا نقشہ بنایا تو اس نے عجیب و غریب حماقتیں دکھائی ہیں۔ مثلاً:۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۷ پر دیکھیں)

بنا بریں ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ اسلام کی معاشی اسکیم کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۲)

(۱) انہوں نے مادّی مفاد کو جب سامنے رکھا تو انہیں اخلاقیات کو اپنے نقشۂ زندگی میں جگہ دینے کی کوئی جگہ نہ ملی۔ حالانکہ اخلاقیات کے صریح مادّی نتائج بھی ہوتے ہیں اور اخلاق پیداوارِ دولت (Production of Wealth) تک میں اضافہ کا موجب ہوتے ہیں اور باقاعدہ تجربات سے اخلاقیات کے مادّی اثرات کو کچھ نہ کچھ (Calculate) کیا جاسکتا ہے۔

(۲) انہوں نے تمام معاملات کا دارومدار ضابطہ و قانون کی پابندی پر رکھا حالانکہ ضابطہ و قانون کی پابندی خود دیانتداری کی اخلاقی حِس کی محتاج ہے۔

(۳) انہوں نے انسان کو شریف اور مہذب اور پابند حدود بن کر جینے کے لئے قومی ملکیّت کا قانونی قیدخانہ فراہم کر کے دیا۔ لیکن یہ نہ سوچا کہ خود اس قید خانے کے اندر بھی وہ اخلاق کا محتاج ہے اور اس کے اندر بھی اس کی پستیٔ اخلاق شرّ کے دروازے کھول سکتی ہے ــــ آخر اس قید خانے کا جیلر اور سنتری بھی تو اسی کو بننا ہے اور ہزاروں لاکھوں انسانی زندگیوں کا چارج اس کو سونپا جانا ہے، پھر آخر بغیر اخلاق کے وہ کس طرح ادائے فرض کریگا؟

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

جو اجزاء پہلے بیان ہو چکے ہیں وہ اسکیم کے اصلی اور ٹھوس پہلو ہیں، یہ آخری پہلو جو قانونیات پر مشتمل ہے، اول الذکر پہلوؤں کی امداد اور ان کی پشت پناہی کے لئے ہے۔

تاہم قانونی تدابیر کی اہمیت اپنی جگہ پر بہت شدید ہے۔ اور کسی اسکیم میں سے اگر یہ پہلو نکال دیا جائے تو وہ عیسائیت کی سطح

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۳)

(۴) انہوں نے مرد و عورت کے درمیان ازدواجی رشتے کو بھی تمام تر قانونی بنا دیا ہے لیکن انہوں نے ازدواج کے وسیع تقاضوں کو نظر انداز کر دیا ہے کہ وہ کیسے پاکیزہ جذبات اور کیسی اخلاقی فیاضی کے بل پر پورے ہوتے ہیں۔

(۵) انہوں نے تربیتِ نسل کے لئے مصنوعی ادارے کھول کر "مادریت" کی خانہ پُری کر لی ہے، لیکن ان کو یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ انسانی بچوں کو صرف غذا اور صحت و آرام کے مادی لوازم ہی کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ان جذبات کی ضرورت ہے جو "ماں" کی غیر موجودگی میں اور کہیں سے خرید کر بہم نہیں پہنچائے جا سکتے اور پھر ان کو اخلاقی تربیت کی بھی ضرورت ہے جو صرف والدین اور خاندان کی شفقتوں ہی کے تحت اپنا صحیح اثر دکھا سکتی ہے۔

پر آگرے گا اور پھر اس کا کام نظام قائم کرنا نہیں رہے گا، بلکہ مشنری طرز پر وعظ و تبلیغ تک محدود ہو جاتے گا۔ دوسری تمام تدابیر کی تکمیل قانونی تدابیر ہی سے ہوتی ہے۔

قانونی تدابیر کی دو قسمیں اسلام کی قانونی تدابیر کی دو قسمیں ہیں: ایک طرف وہ قوانین ہیں جو واجبات یا مطلوبات کو متعیّن کرتے ہیں، دوسری طرف وہ قوانین ہیں جو محرّمات یا ممنوعات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یعنی پہلے قوانین وہ ہیں جن کا مقصود امر بالمعروف ہے اور دوسرے وہ ہیں جن کا مدعا نہی عن المنکر ہے۔

پہلی قسم کے قوانین اس غرض کے لئے ہیں کہ افراد کو ایک خاص مقررہ کم سے کم درجے کی شرافت سے نیچے نہ گرنے دیں اور ان سے سوسائٹی کے اتنے حقوق بہرحال وصول کریں جنہوں کا ضرورتمند اجتماعی نظام اور امن عامہ ہے۔

دوسری قسم کے قوانین اس غرض کے لئے ہیں کہ وہ افراد کو سوسائٹی کے لئے مضر بننے سے روکیں اور ان کی مضرتوں کی مدافعت

کریں:

اسلام کے معاشی نظام میں یہ دونوں قسم کے قوانین پائے جاتے ہیں

مطلوبات اس عنوان کے تحت حسب ذیل قوانین داخل ہیں:۔

۱۔ زکوٰۃ و عشر کا قانون۔

۲۔ خراج کا قانون۔

۳۔ تقسیم وراثت کا قانون ———— وغیرہ

ممنوعات اس عنوان کے تحت حسب ذیل قوانین داخل ہیں:۔

۱۔ احترام ملکیّت کے لئے چوری، ڈاکہ، لوٹ مار کی روک تھام کے ضابطے۔

۲۔ دولت عامّہ پر اجارہ داری کو روکنے کے ضابطے۔

۳۔ اخلاقی مفاسد سے کمائی کرنے کو روکنے کے ضابطے۔

۴۔ اسراف اور مظاہرۂ کبر کو حرام کرنے کے ضابطے۔

۵۔ سود اور قمار کو روکنے کے ضابطے۔

۶۔ سٹہ، ناجائز ذخیرہ اندوزی، بلیک مارکیٹ، ناجائز نفع اندوزی کو روکنے کے ضابطے۔

۷ - دھوکے کے معاملات کی حُرمت کے ضابطے۔

۸ - جھگڑے پیدا کرنے والے سودوں کی روک تھام کے ضابطے

وغیرہ ——————

یہاں ان ساری قسموں کے قوانین کی تفصیلی فہرست پیش کرنا ممکن نہیں، صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلام نے معاشی اصلاح کے لئے ان تمام ضروری قانونی تدابیر کو اختیار کیا ہے جو اس کام میں ناگزیر ہیں۔ یہ قانونی تدابیر جب عقائد و اخلاق کی اصلاح اور تعمیرِ معاشرہ کی اسکیم کے ساتھ شامل ہو جاتی ہیں تو ان سے بہترین نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ اسلام کا یہ متوازن قانونی نظام صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے جبکہ اس کے مزاج کے مطابق ایک معاشرہ تعمیر کیا جائے۔ ایک صالح معاشرہ کے اندر اسلام کے معاشیاتی قوانین ٹھیک وہی کام کرتے ہیں جو کسی مضبوط قلعہ کی برجیوں میں بیٹھے ہوئے دربان اور سنتری کرتے ہیں۔ اگر یہ قلعہ جابجا سے شکستہ ہو اور اس کی دیواروں میں بڑے بڑے رخنے موجود ہوں اور اس کے کواڑ اپنی جگہ چھوڑ چکے ہوں۔ تو جب تک اس کی تعمیر جدید

کا سامان نہ کیا جائے، محض بُرجیوں پر بیٹھے ہوئے دیدبان اور سنتری معاشی مفاسد کے لشکروں کو اندر داخل ہونے سے نہیں روک سکتے۔ اسلام کے معاشیاتی ضوابط اتنے وسیع اور دُور رس ہیں کہ انہیں اگر ایک صالح معاشرہ میں نافذ کیا جائے تو کوئی ایسا چور دروازہ کھلا ہی نہیں رہتا جس سے سرمایہ داری کا شیطان گھُس سکے، اور ان قوانین کی روح اگر محفوظ رہے تو نا ممکن ہے کہ مسلم سوسائٹی کے اندر معاشی ناہمواریاں رُونما ہو کر وحدتِ ملّی کو پارہ پارہ کریں۔ اس قانونی نظام کے اندر یہ تو ممکن ہے کہ کوئی شخص اچھی صاف سُتھری زندگی بسر کرنے کے لئے اللہ کے خزانۂ رزق میں سے کوئی بڑا حصّہ پالے۔ لیکن ایسا ممکن نہیں ہے کہ دوسروں سے ان کے حصّوں کے وظائف رزق چھینتا ہُوا اور ان کی حق ماریاں کرتا ہُوا سیم وزر کے قارونی انبار جمع کر سکے۔

آگے کے صفحات کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ ان قانونی تدابیر کے ماتحت کتنی تبدیلیاں رونما ہو سکتی ہیں۔

اسلام کی اسکیم کا عملی نفاذ

(خصوصیت سے پاکستان میں)

اب تک میں نے اسلام کی معاشی اسکیم کو علمی زاویۂ نگاہ سے پیش کیا ہے۔ اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسانی معاشرہ کو معاشی ناہمواریوں سے بچانے کے لئے اسلام ایک مفصل منصوبہ (Plan) اپنے پیش نظر رکھتا ہے۔ وہ ایک خاص ذہنیت بناتا ہے، ایک خاص طرز کا اخلاق سکھاتا ہے، ایک خاص نہج پر سوسائٹی کی تشکیل کرتا ہے اور پھر ایک خاص قانونی نظام برپا کرتا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اسلام کی جو اسکیم میں نے بیان کی ہے اس کی روشنی میں آپ کو پاکستان کے مختلف معاشی مسائل کے عملی حل کا تصور بھی دلا دوں تاکہ آپ اسلامی نظام کی فوقیت کا صحیح اندازہ کر سکیں۔ اور سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے مقابلے میں اس کی قدر و قیمت متعین کر سکیں۔

میں اپنے مقالہ کے اس دوسرے حصے میں یہ بتانا چاہتا ہوں۔ کہ "قرارداد مقاصد" کے تقاضوں کے مطابق اب اگر پاکستان کا چارج عملاً اسلام کو مل جائے تو وہ ہمارے ہاں کی معاشی ناہمواریوں کے ختم کرنے کے لئے اپنے خاص اصولوں کے تحت کیا عملی تدابیر اختیار کرے گا۔

اور یہ کہ اسلامی نظام کا نام لینے والوں کی ذمہ داریاں اس بارے میں کیا ہیں؟

ا۔ چند کاروباری مفاسد کا سدِّباب

ہم آج جن معاشی ناہمواریوں سے دوچار ہیں ان کے پیدا کرنے والے مختلف وجوہ میں وہ بڑے بڑے کاروباری مفاسد بھی شامل ہیں جو آج کی مارکیٹ کی رگ رگ میں خون بن کر گردش کر رہے ہیں جب تک ان زہریلے عناصر سے کاروبار کے عروق و اعصاب کو پاک نہ کر لیا جائے ہم معاشی ناہمواریوں کی اصلاح پر کبھی قادر نہیں ہو سکتے۔

سُود ان کاروباری مفاسد میں اوّلین اہمیت سُود کی ہے۔ ہمارا نظامِ معیشت سُودی نظامِ معیشت ہے۔ اور سُود کا وجُود اسلام کی عین نفی ہے۔ سُود کو اسلام نے اعتقادی، اخلاقی اور قانونی ہر لحاظ سے حرام ٹھہرایا ہے۔ اور پھر سُود کی حُرمت کی نوعیت ایسی شدید بتائی ہے کہ ایک مسلمان سوسائٹی کے لئے سُودی نظامِ معیشت کا جاری رہنا ناقابلِ برداشت عذاب ہونا چاہیئے۔ قرآن نے سود خواروں کو "فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہٖ" کا پیغام سنایا۔ یعنی خدا اور

رسول کی طرف سے سود کے خلاف اعلانِ جنگ کیا گیا۔ پھر سود خواری ہی نہیں، بلکہ سودی معاملات کی دستاویزات لکھنے اور حسابات رکھنے کو بھی قابلِ مواخذہ جرم قرار دیا گیا۔ دوسری طرف حدیث نبوی نے سود کے جرم کا بھاری پن اور اس کے اثرات بد کی وسعت کو واضح کرنے کے لئے یہ حقیقت بیان کی کہ سود خواری کا گناہ ستّر مرتبہ کی زناکاری سے بھی زیادہ شدید ہے۔ حرمت ربوٰا کی اس نوعیت کو معلوم کر لینے کے بعد نبی صلعم کے صحابہ نے اپنے آپ کو نہ صرف ربوٰ سے پوری طرح بچایا ہے بلکہ ریبہ (وہ معاملات جو صریحاً سودی معاملات نہ ہوں۔ لیکن ان میں ربوٰا کا رنگ یا شائبہ پایا جاتے یعنی سودی معاملات سے مشابہت ہوتی ہو) سے بھی پوری طرح اجتناب کیا۔

سود کی حرمت کی اس شدت کے محسوس کرنے کے بعد ایک مسلمان کے لئے یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ سود کی قسم بندیاں کرے اور پھر اس بات کی فقہی گنجائشیں ڈھونڈے کہ فلاں قسم کا سود اگر حرام ہے تو فلاں قسم کا سود کھانے میں شریعت مانع نہیں ہے۔ لیکن انحطاط پذیر ذہنوں نے یہ بھی کیا۔ کہا جاتا ہے کہ شخصی سود خواری تو حرام ہے لیکن بنکوں کے سود کو اسلام کیسے

حرام قرار دے سکتا ہے جو کاروبار کی ترقی کا ذریعہ بنتے ہیں اور جو درحقیقت سُود نہیں بلکہ منافع تقسیم کرتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں نہ صرف یہ کہ اسلام کو نہ سمجھنے کی دلیل ہیں۔ بلکہ جدید معاشیات اور دورِ حاضر کے بنکنگ سسٹم کو نہ سمجھنے کی گواہی بھی دیتی ہیں۔ مَیں چاہتا ہوں کہ بنک کے سُود کی ماہیت پر چند باتیں عرض کر دُوں۔

بنکوں کا سُود

بنک کے سُود میں ٹھیک وہی خباثتیں پائی جاتی ہیں جو شخصی سُودی معاملات میں ہوتی ہیں، اس کا ظاہر بدل جاتا ہے، باطن نہیں بدلتا۔ بنک کے سُود کی حقیقت یہ ہے کہ بنک جن لوگوں کے سرمائے سے چلتے ہیں وہ اپنے لاکھوں اور کروڑوں روپے ایک بنک کے کاروبار میں اس سمجھوتے پر لگاتے ہیں کہ ان کو بہرحال سال کے خاتمے پر اتنے فیصد منافع لازمًا ادا کر دیا جائے۔ چاہے بنک کو نفع ہو، یا نقصان، یا نفع ہو تو کم نفع ہو یا زیادہ۔ اب یہ ظاہر ہے کہ بنک اپنے دفاتر اور ذخائر کے اندر سے تو منافع نکال کر سرمایہ داروں کو دے نہیں سکتا اور نہ ان کے جمع کردہ روپے میں نسل کشی کی استعداد موجود ہے۔ بنک بہرحال ایک طرف

سے لیکر ہی دوسری طرف دے سکتا ہے۔ چنانچہ کوئی بنک جب اپنا سرمایہ بڑے بڑے کاروباری اداروں اور صنعتی کارخانوں میں لگاتا ہے تو وہ بھی اسی اصول پر شرح منافع پہلے سے طے کر لیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرز پر کاروباری ادارے اور صنعتی کارخانے اپنی مصنوعات اور مال تجارت کی قیمتوں میں سُود کی وہ رقم شامل کر دیتے ہیں جو بنکوں کی طرف سے اُن کے ذمّے آتی ہے۔ یہاں تک کہ سُود کی بلا آخر کار ضروریات زندگی کے اس آخری عام گاہک کی جیب پر آپڑتی ہے جو اس کو کسی دوسرے پر پھینک نہیں سکتا۔ یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک ملک کے بنک کئی کروڑ روپیہ سالانہ کی جو رقم منافع کے نام سے اپنے حصّہ داروں میں تقسیم کرتے ہیں وہ اس ملک کے غربا اور عوام ہی کے جیبوں سے غیر محسوس طریق سے نکل کے آتی ہے۔ ایک سُودی نظامِ معیشت کے تحت آپ بازار میں جا کر اگر ایک آنے کی ٹکیہ یا تین پیسے کی دیا سلائی بھی خریدتے ہیں تو اس ایک آنے اور تین پیسے میں بھی سرمایہ داروں کا وہ چندہ شامل ہوتا ہے جسے بنک منافع کے نام سے بہم پہنچاتے ہیں۔ جس سوسائٹی میں بنکوں کا سُود جائز قرار دیا گیا ہو اس میں کسی متقی ترین

فرد کے لئے بھی یہ ممکن نہیں رہتا کہ اپنے دامن کو سُود کے داغ سے پاک رکھ سکے۔ حرام کا یہ ہمہ گیر زہر حلال اور پاک اشیا میں بھی سرایت کر جاتا ہے۔ سُودی نظام میں قدرتی طور پر اشیاء کی قیمتوں کے ساتھ سُود کا بار شامل ہو کر ان کو بوجھل بناتے رکھتا ہے، دوسری طرف ربائی معیشت ملک کے چند مالدار افراد کے پاس عوامی دولت کو ہر طرف سے سمیٹ سمیٹ کر لے آتی ہے اور اس کا نتیجہ خطرناک ناہمواریوں کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔

پس اسلام کے منشا کے مطابق اگر معاشی ناہمواریوں کو ختم کرنا ہو تو پھر سوسائٹی کو سُود سے پاک کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ سُود اگر کتاب وسُنّت کی رُو سے حرام ہے تو اسے پاکستان کی اسلامی ریاست میں قانونی طور پر بھی حرام ہونا چاہیئے۔

سُود کی حُرمت کو عملی جامہ پہنانے کا ذکر آتے ہی یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر سُود کو قطعی طور پر ممنوع ٹھہرا دیا جائے تو بنکنگ سسٹم کا سرے سے خاتمہ ہو جائیگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بنکوں کے بغیر آج نہ تجارت چل سکتی ہے اور نہ حکومت کے مالیات کا

نظام ہی برقرار رہ سکتا ہے۔

یہ سوال یقیناً ایک وزنی سوال ہے اور آپ کے سامنے جو لوگ سود کی حرمت کا پیغام لا رہے ہیں وہ اس سوال کی اہمیت سے غافل نہیں ہیں، لیکن وہ اس کو لاینحل نہیں سمجھتے —— اور درحقیقت دنیا میں کوئی سوال لاینحل نہیں ہے، بشرطیکہ کسی قوم اور حکومت میں اس کے حل کرنے کا سچا عزم موجود ہو۔ ایک ایسا گروہ جو اپنے اصولوں کا محافظ و پاسباں ہوتا ہے وہ ان کو قائم کرنے کے لئے سو راہیں ڈھونڈ نکالتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اپنی دنیا آپ بنانے کا ولولہ موجود ہو اور خودی اتنی زندہ ہو کہ دوسروں کے در پہ اصول و افکار کی گداگری کی ذلت کو گوارا نہ کر سکے۔ یہ اوصاف اگر کسی گروہ میں نہیں ہیں تو اس کے لئے اس آسمان کے نیچے حقیقی آزادی نہ پہلے کبھی تھی اور نہ آئندہ کبھی ہو گی۔

اسلامی نظامِ معیشت آپ کو ایک نئے بنکنگ سسٹم کے قائم کرنے کے لئے سود کے اصول کے بجائے مضاربت کا اصول

مہیا کرتا ہے۔ اصُولِ مضاربت کا مفہوم یہ ہے کہ ایک طرف کا سرمایہ اور دوسری طرف کی محنت باہم متعاون ہو کر کام کریں اور نتائج میں کسی طے شدہ تناسب کے مطابق دونوں شریک ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں اصُولِ مضاربت کے معنی "حصّہ داریٔ نفع و نقصان" کے ہیں۔ اس اصول پر اگر بنکوں کو سرمایہ دیا جائے اور اسی اصول پر اگر بنک تجارتی اور صنعتی اداروں کو سرمایہ فراہم کریں تو صنعت و تجارت کا سارا نظام بھی نہایت بہتر طریق سے چل سکتا ہے اور ان کے مالیات کو بھی نئے انداز سے اُستوار کیا جا سکتا ہے۔

پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر داخلی ضروریات کے لئے اس طرح کا کوئی بنکنگ سسٹم چل بھی نکلے تو بہر حال بین الاقوامی مالی اور تجارتی روابط کے لئے یہ کار آمد نہیں ہو سکتا۔ اصولِ مضاربت پر نہ ہم بیرُنی سرمایہ حاصل کر سکتے ہیں اور نہ اس اصُول پر چلنے والے بنکوں کو تجارتِ خارجہ کا وسیلہ بنا سکتے ہیں۔ اس بارے میں یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ کوئی بھی اصول جب تک اپنے گھر میں اختیار کر کے کامیابی کی منزل تک پہنچا نہ دیا جائے، اس کے لئے گھر سے باہر

کبھی بھی قبولیّت حاصل نہیں کی جا سکتی۔ بہرحال ایک نئے بنکنگ سسٹم کو آپ چند سال میں اپنے ہاں پروان چڑھا کر اسے سُودی سسٹم سے بہتر ثابت کریں گے اور پھر اس کے حق میں مرعوب کُن لٹریچر کی ایک بڑی مقدار دنیا کے ممالک کو فراہم کر دیں گے تب کہیں دنیا اس سسٹم پر اعتماد کر سکے گی، اور جب تک یہ منزل نہ آجائے آپ کو اپنے بین الاقوامی مالی و تجارتی روابط کو اوّل تو ایسی ناگزیر ضروریات تک محدود کرنا ہوگا جن کو باہر سے پُورا کیے بغیر چارہ ہی نہ ہو، اور پھر جو معاملات کرنے پڑیں گے ان میں سُود کی آلائش کو اضطراراً گوارا کرنا پڑیگا۔ لیکن جب وہ منزل آجائے گی تو شاید آپ کو وُہ دن دیکھنا بھی نصیب ہوگا جبکہ آپ سرمایہ دار ملکوں سے بزور مطالبہ کریں گے کہ جسے ہم سے تجارتی و مالی تعلقات رکھنے ہوں وہ اپنے ہاں غیر سُودی بنکنگ کو قائم کرے، کیونکہ ہم سُودی معاملات سے قطعی طور پر الگ ہو چکے ہیں۔ اور آپ دیکھیں گے کہ آپ کے ہاں سے تربیت پا کر لوگ جائیں گے اور اپنے ملکوں میں غیر سُودی بنکنگ سسٹم کا نیا تجربہ کریں گے اور پُوری دنیا پر آپ کا اصُول

مضاربت چھاتا چلا جائے گا۔

اس مہم کو سر کرنے میں جو مشکلات بیان کی جاتی ہیں وہ بہرحال اتنی ضرور ہیں جتنی ایک پرانے نظام کو چھوڑ کر نئے نظام کو برپا کرنے میں پیش آیا کرتی ہیں اور ان کو حل کرنے میں یقیناً عرق ریزی کرنی پڑے گی۔ آپ کے ملک کے علمائے دین اور علمائے معاشیات کو سر جوڑ کر بیٹھنا ہو گا اور دو طرفہ معلومات کی روشنی میں اصول مضاربت پر بنکنگ سسٹم کے قائم کرنے کا منصوبہ تیار کرنا ہو گا۔ پھر اس منصوبہ کے مطابق ابتداءً سود کے اصول کو قانوناً کالعدم قرار دیا جائیگا اور سود کے اصول پر جو سرمایہ بنکوں نے مصروف کر رکھا ہے اُسے واپس سمیٹنے کے لئے اُن کو ایک محدود مہلت دی جائے گی اور اس کے ساتھ ساتھ حکومت اپنی نگرانی میں غیر سودی بنک قائم کریگی جو پھر تدریج پھیلے گا اور نہایت تیزی سے بنکوں کے سرمائے اس کی طرف منتقل ہونے لگیں گے، نیز آہستہ آہستہ دوسرے بنک اسی طرز پر وجود میں آنے لگیں گے۔ اِن تجربات کے ساتھ ساتھ اسلامی بنکنگ کی نئی سائنس خود بخود ارتقا کرے گی اور اس کے

لئے لٹریچر مرتب ہوتا جائے گا۔ اور ماہرینِ فن تیار ہو کر میدان کار میں آتے جائیں گے۔ اس سلسلے میں اوّلین اقدام یہی ہے کہ تبدیلی کا فیصلہ کر لیا جائے۔ جس دن ہم سُود کے شیطان کو ملک بدر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس دن معاشی ناہمواریوں کی ایک بڑی علّت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

ذخیرہ اندوزی اور سٹہ | سُود کے بعد دُوسرے درجے پر جو فتنہ انگیز خباثت ہمارے کاروبار میں دخیل ہے وہ ذخیرہ اندوزی اور سٹہ بازی کی ہے۔ موجودہ بگڑے ہوئے نظام کے تاجر عوام کی خدمت کر کے حلال روزی کمانے کے بجائے عوام کو دکھ دیکر حرام کمائی کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ان کا طریقہ یہ نہیں کہ جس چیز کی کمی ہو رہی ہو، اسے فراہم کر کے حق الخدمت وصول کریں، بلکہ ان کی روش یہ ہے کہ جو چیز عوام کو آسانی سے مل سکتی ہو، اس کے ذخائر جمع کر کے روک رکھے جائیں اور عوام کو اتنا سسکایا جائے کہ پھر ان کی جیبیں کاٹنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ یہ غیر فطری کمائیاں کرنے کا ایک ایسا ڈھنگ ہے جس کی وجہ سے سوسائٹی میں لازماً معاشی ناہمواریاں

فروغ پاتی ہیں۔ موجودہ بنکنگ سسٹم نے اس ذخیرہ اندوزی کے جُرم کو "پیمانۂ کبیر" پر عمل میں لانے کے لئے سہولتیں پیدا کر دی ہیں اور اس جُرم کے لئے نقد سرمائے کی تنگ دامانی کو وسعت میں بدل دیا ہے۔ کسی نقد سرمائے کے استعمال کئے بغیر ذخائر اجناس کو "قید" میں رکھا جا سکتا ہے۔ پھر ان اجناس کے "خیالی" ہی "خیالی" سودے ہوتے رہتے ہیں اور ہر سودے کا منافع ان کی قیمتوں پر اپنا بوجھ ڈالتا چلا جاتا ہے۔ جو آخر کار عوام کی جیبوں پر جا کے پڑتا ہے۔ پھر بڑے بڑے تاجر جب مِل جُل کر کاروباری گٹھ جوڑ قائم کر لیتے ہیں اور ذخیرہ اندوزی اور سٹہ بازی کی پوری فضاؤں پر چھا جاتے ہیں تو پھر منڈی اور کاروبار ان کے بے بس غلام بن جاتے ہیں "قیمتیں" اُن کے اشارۂ ابرو پر ناچتی ہیں، چھوٹے تاجر ان کی اجارہ داری کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ حکومت کے مالیات پر بھی یہ ہر طرح کا اثر ڈالنے پر قادر ہو جاتے ہیں۔

یہ سٹے اور ذخیرہ اندوزی کا نظام لازماً معاشی ناہمواریوں کو ترقی دیتا ہے۔ اور عوام پر بڑے بڑے تاجروں کی ظالمانہ کمائیوں کا بوجھ بالواسطہ طور پر لاڈ دالتا ہے۔ اسلام ان دونوں مفاسد کا دشمن ہے

اور اس کے نظامِ معیشت میں کاروبار کو جن اصولوں پر منظم کیا جائیگا ان کے فریم میں ان دونوں سرمایہ دارانہ اصولوں کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

دوسرے کاروباری مفاسد | ان دو بنیادی مفاسد کے علاوہ کاروباری دنیا میں اور بھی بہت سے وجوہِ فتنہ پائے جاتے ہیں اور اسلام ان میں سے کسی کو گوارا نہیں کر سکتا۔ اسلام کے ضابطۂ تجارت میں لین دین اور معاملات کی بہت سی ایسی شکلیں ممنوع ٹھہرائی گئی ہیں جو اجتماعی اخلاق کو بھی نقصان پہنچاتی ہیں اور معاشی ناہمواریوں میں بھی اضافہ کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ ان مختلف شکلوں کی تفصیل میں اس مقالہ میں نہیں کر سکتا، فقہ کی کتابوں میں معاملات کے کئی باب ان کو محیط ہیں۔ کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ اسلام کے کاروباری ضوابط کے اصول و حِکَم کو پیش نظر رکھ کر دورِ حاضرہ کے کاروبار کے پیچیدہ نظام کے مختلف گوشوں کا جائزہ لیا جائے اور ان میں جو مفاسد کارفرما ہیں ان کی روک تھام کے لئے اسلامی ذہنیت کے ساتھ جدید فقہ بندی کی جائے۔ پھر پوری حکمت کے ساتھ اسلام کے ضابطۂ تجارت پر مارکیٹ کے نظام کو ڈھال دیا جائے۔

۲- زرعی نظام کی اصلاح

پاکستان میں جن ناہمواریوں کو نہایت شدّت سے محسوس کیا جا رہا ہے، ان میں اکثر و بیشتر وہ ہیں جو دنیائے زراعت سے متعلق ہیں پس پاکستان جیسے زرعی ملک میں زمین کے مسائل اپنے حل کے لئے اوّلین توجہ چاہتے ہیں۔ ان مسائل میں سے ایک نمایاں مسئلہ جاگیروں کا ہے۔

جاگیروں کا محاسبہ | اس مسئلہ پر گفتگو کرنے سے پہلے میں پُوری صفائی سے یہ عرض کر دینا چاہتا ہُوں کہ ہم لوگ جاگیروں کے مسئلے کو اس زاویۂ نگاہ سے دیکھنے پر کبھی تیار نہیں ہیں جو عام طور پر فضا میں رائج ہے۔ ہم اس معاملے میں جو کچھ رائے بھی قائم کر سکتے ہیں، اپنے علم کی حد تک اس کو کتاب و سُنّت کی ہدایت سے اخذ کرتے ہیں اور اگر کتاب و سُنّت کی رُو سے ہماری رائے کی غلطی ہم پر واضح کر دی جائے تو ہر لحظہ اس میں ترمیم کرنے کو تیار ہیں۔ اسلام اگر کسی جاگیر کو جاگیردار کے پاس چھوڑنا چاہے تو چاہے ساری دُنیا مِل کر

اس کے سلب کرنے کا فیصلہ کرے، ہم بہر حال اس فیصلہ کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکیں گے، اور اسی طرح اگر اسلام ساری جاگیروں کو جاگیرداروں سے سلب کر کے حکومت کی تحویل میں لانے کا یا کسانوں میں بانٹ دینے کا اشارہ کرے تو چاہے کتنی ہی بڑی طاقتیں اس اشارہ کو جھٹلانے کی کوشش کریں، ہمارے نزدیک یہی اشارہ واجب التعمیل ہے۔

اس جملۂ معترضہ کے بعد اصل مسئلہ کی طرف آئیے۔ نظام جاگیرداری کئی سو سال تک پوری دنیا پر مسلّط رہ چکا ہے اور زمین کے بعض گوشوں میں اب تک اس کا چلن باقی ہے۔ خود پاکستان میں بھی اس کے آثار موجود ہیں۔ اس نظام کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ سلطان وقت یا حکومت اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے ملک کے ایسے تمام با اثر اور نمایاں اشخاص کی وفاداریاں خرید لیتی ہے۔ جو اگر تعاون کریں تو سلطنت مستحکم رہتی ہے اور بگڑ جائیں تو تخت کے پائے متزلزل ہو سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی وفاداریوں کی خریداری کے لئے دوسرے مختلف ذرائع کے ساتھ ساتھ "جاگیر" کو زیادہ

سے زیادہ استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ "جاگیر" صرف ایک قطعۂ زمین ہی نہیں ہوتی، بلکہ اس قطعۂ زمین کے ساتھ کسانوں اور کمیّوں کی ایک بڑی "رعیّت" بھی ہوتی ہے جس کی آزادی اور معیشت کو حکومت ایک باا ثر شخص کی وفاداری کی خرید کے لئے داؤں میں لگاتی ہے۔ جاگیردار حکومت کو فوجی قوت بھی فراہم کرنے کا ذمّہ دار ہوتا ہے، اور مالی قوت بھی — اور اس کے صلے میں وُہ اپنے حلقۂ اثر کے افراد انسانی پر خدائی کا حق حاصل کرتا ہے۔ اس طرح سے سالہا سال کے مسلسل عمل نے جاگیرداری کے ساتھ نہایت ذلیل اور گھناؤنی روایات وابستہ کر دی ہیں اور جہاں کوئی جاگیر پائی جاتی ہے اس کے ساتھ یہ روایات کسی نہ کسی درجے میں موجود ہوتی ہیں۔

مغلیہ دورِ حکومت میں جاگیر کی یہ نوعیت بکثرت پائی جاتی تھی لیکن اس کے علاوہ جاگیروں کی ایک قسم داد و دہش اور بخشش کی صورت میں بھی وجود میں آتی رہی ہے۔ ان دو قسموں کے علاوہ ایک تیسری قسم صلۂ خدمات کی بھی تھی، یعنی حکومت بعض مواقع پر نقد "تنخواہ" یا انعام کے بجائے زمین اپنے کارکنوں کو تفویض کر دیتی تھی۔ پھر کچھ جاگیرداریاں

مالیہ وصول کرنے کی ایجنسیوں کی شکل میں نمودار ہوتیں اور بعد میں وہ لوگ جو ان کے انچارج تھے مستقل طور پر مالک بن گئے یا بنا دیئے گئے۔

انگریزی دورِ حکومت میں نظامِ جاگیرداری اپنی عمر کی آخری منزلوں میں داخل ہو گیا تھا، لیکن پھر بھی پہلے کی بے شمار جاگیریں موجود تھیں۔ اور بحال رہیں۔ اور انگریز حکام نے بھی جاگیر کو وفاداریاں خریدنے کا ذریعہ بنانا اپنے لئے مناسب سمجھا، چنانچہ ایک نظامِ باطل کو عام ہندوستانی باشندوں کے علاوہ خود ملتِ اسلامیہ پر مسلط کرنے کے لئے جاگیروں نے بے شمار لَا اِلٰہ خوانوں کو مجاہد بنا کر انگریز کے سامنے صف آرا کر دیا۔

جاگیرداریوں کی اِن نوعیتوں کو سامنے رکھنے کے بعد جب ہم اسلامی نقطۂ نظر سے پیشِ نظر مسئلہ کو سوچتے ہیں تو ہمیں تاریخِ اسلام سے اس بات کا ثبوت تو ملتا ہے کہ اسلامی حکومت نے اپنے کارندوں کو بعض اوقات معاوضۂ کار کے طور پر زمینیں تفویض کی ہیں لیکن ان کے ساتھ جاگیردارانہ نظام کی ناپاک روایات کبھی نہ تھیں اور نہ ان کو

اسلامی حکومت نے خدا کے بندوں کے حقِ آزادی، حقِ "مساوات" اور
حقِ معیشت کے سلب کرنے کا ذریعہ بننے دیا ہے لیکن خاص طور پر وہ
جاگیریں جن کو ایک نظامِ باطل کے قیام و تسلّط کے لئے استعمال کیا گیا ہو
اور جن کو تجدید و احیائے دین کی ہر کوشش کو کچلنے اور اسلامی تہذیب
کو شکست دینے کے لئے ذریعہ بنا لیا گیا ہو اُن کے بارے میں اسلام
سے جواز کا فتویٰ بہر حال نہیں مل سکتا۔ رہا داد و دہش کا مسئلہ، سو اسلامی
ریاست اور مسلم سوسائٹی کی کسی اجتماعی ملکیت کو شاعروں کے قصیدوں
اور بھانڈوں کے لطیفوں پر لٹانے کی اجازت اسلام کے قانون نے
کبھی نہیں دی۔ چنانچہ حضرت خالدؓ جیسے چوٹی کے قابلِ اعتماد حاکم نے
جب ایک شاعر کو اس کے کلام پر دس ہزار درہم بطور انعام دیئے
تو حضرت عمرؓ نے اس پر شدید گرفت کی، مقدمہ چلایا۔ اور اسی معاملے پر
ان کو معزول کر دیا۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ پاکستان میں جو جاگیریں امتِ
محمدیؐ کے لاکھوں افراد پر ظلم کرنے کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں اور جن میں سے
بیشتر وہ ہیں جو کسی جائز بنا پر وجود میں نہیں آئیں، کیا اُن کو سلب کرنے

کے لئے اسلام میں کوئی سندِ جواز ہے؟ کوئی صریح آیت یا حدیث یقیناً اس سوال کا دو ٹوک جواب دینے کے لئے موجود نہیں ہے لیکن اصولاً یہ بات بادنیٰ تامّل سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک ظالم حکومت نے اگر پبلک کے اموال و املاک کو ناجائز طور پر لٹایا ہو تو اس حکومت کی جانشین حکومت اس کے فیصلوں کو بدل کر اصلاح کر سکتی ہے۔ پھر خصوصاً معاملہ اگر اُمّتِ مسلمہ کے اجتماعی اموال و املاک کا ہو، اور انہیں کسی مسلم یا غیر مسلم حکمراں نے اسلام کی ہدایات سے قطع نظر کر کے ظالمانہ طریق پر کچھ افراد کے تصرّف میں بعض حرام مقاصد کے لئے دے دیا ہو تو ایک صحیح اسلامی حکومت وجود پاتے ہی سابق حکومت کے غلط تصرّفات پر خطِ تنسیخ کھینچ سکتی ہے۔

میرے اس دعویٰ پر خلافتِ راشدہ کے ایک سے زائد عملی نظائر موجود ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ :-

(۱) عراق پر جب اسلامی حکومت کا قبضہ ہُوا تو حضرت عمرؓ نے تحقیق کی اور خاندانِ شاہی کی ساری جاگیروں کو سلب کر کے اسلامی بیت المال کی ملکیّت قرار دے دیا۔

(ب) رومی حکومت نے جب شام اور مصر پر قبضہ کیا تو تمام اراضیات اصلی باشندوں سے چھین کر درباریوں اور فوجی افسروں اور شاہی خاندان کے افراد کی جاگیروں میں بدل دیں اور کچھ کلیسائی معبدوں کے لئے وقف کر دیں۔ حتیٰ کہ مقامی آبادی کے پاس چپہ بھر ملکیتی زمین بھی باقی نہ رہی، بلکہ اصل باشندگانِ ملک خود اپنی زمینوں میں مزارعین بن کے رہ گئے۔ حضرت عمرؓ نے جونہی ان ممالک پر قبضہ کیا، تمام جاگیرداریوں کو اصل مقامی مالکوں کی طرف لوٹا دیا، بلکہ مقامی مظلوم باشندوں کی دادرسی کی خاطر مسلمانوں کو کسی زمین پر قبضہ کرنے یا کسی قطعۂ اراضی کے خریدنے سے خاص طور پر روک دیا۔

(ج) اوپر کی دونوں نظیریں اُن جاگیروں کے متعلق ہیں جو غیر مسلم حکمرانوں نے قائم کی تھیں۔ لیکن حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جو خلفائے راشدین کی صف میں شریک ہیں، ان جاگیروں کے بارے میں بھی ایک قطعی نظیر قائم کر دی ہے جو مسلم حکمرانوں نے غلط مقاصد کے لئے قائم کی ہوں۔ آپ نے مسند آرائے خلافت ہونے کے بعد پہلا بڑا کام یہی کیا کہ تمام غلط جاگیروں کے قبالے مسجد میں مجمع عام کے روبرو طلب

گئے۔ پھر اپنے بیٹے کو پاس بٹھایا۔ جو ایک ایک جاگیر نامے کو پڑھتے جاتے تھے اور حضرت عمرؓ اسے کالعدم قرار دیتے جاتے تھے۔ سب سے پہلے آپ نے اپنی اور اپنے اقربا کی جاگیروں کے قبالوں کو قینچی کے حوالے کیا؛ پھر شاہی خاندان کے دوسرے ارکان اور درباریوں کے قبالوں کو پرزے پرزے کیا۔ یہاں تک کہ کوئی جاگیر نامہ بھی سلامت نہ رہا۔ اس کارروائی کو دیکھ کر بعض لوگ تلملائے۔ اس پر ابن عبدالعزیز نے ان کو متنبہ کیا کہ خبردار! اگر میرے راستے میں روڑے اٹکاؤ گے تو میں اس خلافت کو جو امانۃً مجھے سونپی گئی ہے لے جا کے مدینے کے عوام کے حوالے کر دونگا! چنانچہ بڑے بڑے جاگیردار دم بخود ہو کے بیٹھ رہے۔ ان نظیروں کی روشنی میں ہم کو اُن ساری جاگیروں کا محاسبہ کرنا ہوگا جن کے متعلق کاغذات مال و اراضی سے ضروری معلومات مل سکتی ہیں۔ پھر تمام ناجائز قسم کی جاگیروں کے قبالوں پر حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کی طرح قینچی چلانی ہو گی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت ہی نازک ذمہ داری کا کام ہے اور اسے سرانجام دینے کے لئے علمائے دین، محکمۂ مال کے تجربہ کار افسروں اور قانون کے ماہرین کا

ایک مشترکہ بورڈ جاگیروں کی نوعیتوں اور ان سے تعلق رکھنے والے مسائل پر جب تک خوب اچھی طرح چھان بین کر کے کوئی باقاعدہ پروگرام مرتب کر کے نہ دے، محض اندھا دھند کوئی کارروائی نہیں کی جاسکتی، کیونکہ یہاں قومی ملکیّت کا اصُول پیشِ نظر نہیں ہے، بلکہ سوال خدا اور رسول کی ہدایت کے اتباع کا ہے۔

واضح رہے کہ اسلامی قانونِ اراضی کی روشنی میں حسب ذیل اقسام کی جاگیریں ناجائز قرار پاتی ہیں :-

۱- کوئی حکومت جس زمین کو جاگیر بنا کر دینے کی مجاز ہی نہ ہو، وہ اگر جاگیر بنائی گئی ہو تو کالعدم قرار دی جائے گی۔ حکومت صرف مَوَات (افتادہ) اور خالصہ (سرکاری) زمینوں میں سے کوئی عطیہ دینے کی مجاز ہے، لیکن اگر شہریوں کی ملکیتی اراضی کو جاگیر بنا دیا گیا ہو تو یہ ناجائز کارروائی ہے۔

۲- وہ تمام جاگیریں ناجائز ہیں جو اسلام کے نقطۂ نگاہ سے مفادِ عامّہ کے بجائے کسی اور مقصد کے لئے دی گئی ہوں۔

۳- وہ تمام جاگیریں بھی ناجائز ہیں جو چاہے مَوَات اور خالصہ

زمینوں میں سے ہی دی گئی ہوں اور مفاد عامہ ہی کے لئے دی گئی ہوں لیکن حدِ اعتدال سے زیادہ دی گئی ہوں۔ اسلام میں حدِ اعتدال سے مراد یہ ہے کہ اتنی زمین جس سے ایک شخص آسودگی سے اپنی گذر بسر کر سکے۔

۴۔ وہ جاگیریں جو مالیہ کی وصولی کی ایجنسیوں سے بدل کر ملکیتی جاگیریں بن گئی ہیں وہ بھی ناجائز ہیں۔

۵۔ وہ جاگیریں جو کسی خاص مفاد عامہ کے مقصد کو سپورٹ کرنے کیلئے قائم کی گئی تھیں لیکن اب سرے سے وہ مقصد باقی نہیں رہا۔ اب وہ بھی ناجائز قرار پائینگی۔

ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ہاں کی بیشتر جاگیریں ایسی ہیں جو انہی ناجائز اقسام میں داخل ہیں لیکن اسلام نے چونکہ شہریت کے بنیادی حقوق میں ملکیت کے حق کو نمایاں مقام دیا ہے اور اس حق کا بڑا احترام اسکی نگاہ میں ہے اس لیئے جاگیروں کو سلب کرنے کیلئے تحقیقات ضروری ہے۔ ایک ایک جاگیر کا محاسبہ کرنا اور جائزہ لینا اسلامی انصاف کی رو سے اشد ضروری ہے۔

بقیہ زمینداریاں | جاگیروں کا مسئلہ اگر صاف ہو جائے تو پھر پاکستان میں بہت تھوڑی سی بڑی زمینداریاں باقی رہ جاتی ہیں، جن کو معاشی ناہمواریوں کے پیدا کرنے میں کچھ زیادہ دخل حاصل ہے، ان زمینداریوں کے بارے میں دو اقدام کرنے پڑیں گے۔ ایک یہ کہ وہ زمینیں جو خلاف اسلام قوانین کے بل پر ناجائز مقدمہ بازیوں کے تحت اور کھلی ناانصافیوں کے ذریعے قرقیاں اور نیلامیاں کر اکے یا سود اور رہن کے

واسطوں سے ہتیائی گئی ہیں، ان کے بارے میں تحقیقاتی بورڈ بٹھا کر عوام کو استغاثے پیش کرنے کی عام دعوت دی جائے اور پھر اسلامی قانون کے تحت حقداروں کو ان کے حقوق بہم پہنچائے جائیں۔ دوسرا ضروری اقدام یہ ہے کہ اِن زمینداریوں پر فی الوقت اسلام کے قانون وراثت کا ایک وار ہو جانا چاہیئے۔ اس طرح ان کے چار چار چھ چھ آٹھ آٹھ ٹکڑے ہو سکتے ہیں اور پھر بڑی زمینداریاں شاذ ہی باقی رہ جائیں گی۔ اسلام کے قانونِ وراثت کا عمل اگر بہت پیچھے سے کرنے کے لئے کوئی فقہی دلیل یا عملی نظیر موجود نہ ہو تو بھی بہر حال آج جو لوگ زمینوں پر قابض ہیں اُن سے قانوناً یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی املاک میں جن زندہ مستحقین (خصوصاً خواتین) کے حقوق وراثت شامل ہیں ان کو ادا کر دیں۔ اس طرح بعض بڑی زمینداریوں کی کمر ایک ہی وار میں اور بعض کی آگے چل کر دوسرے وار میں ٹوٹ جائے گی۔

تین سالہ افتادہ زمینیں | فقہ کا ایک قانون یہ ہے کہ اگر حکومت کی دی ہوئی کوئی زمین تین سال تک افتادہ اور بنجر پڑی رہے اور اس

کا عارضی مالک اُس کو آباد کرنے سے قاصر رہے تو مسلم سوسائٹی کے ہر فرد کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اس میں جا کر ہل چلائے اور اُسے آباد کرے، اور اس کا مالک قرار پا جائے۔ اسلامی حکومت کو یہ حق بدرجۂ اُولےٰ پہنچتا ہے۔ یہ قانون نبی صلعم کے بعض فرمودات سے ماخوذ ہے اور خود خلافتِ راشدہ میں برسرِ عمل رہ چکا ہے۔ علاوہ بریں جو زمینیں شخصی ملکیت میں ہوں اور ان کو تین سال تک غیر آباد رکھا جائے تو اُن پر ٹیکس عائد کرنا جائز ہوگا تاکہ زمینداروں کو اس سے روکا جائے کہ وہ آبادکاروں سے من مانی شرائط پر معاملہ کرنے کے لئے زمینوں کو غیر آباد نہ رکھ سکیں۔ آج بھی اگر اسلامی نظام پاکستان میں قائم ہو تو یہ قانون دوبارہ زندہ ہو کے رہے گا اور پاکستان کے کئی لاکھ ایکڑ کے وہ بنجر رقبے جن سے ان کے مالک کوئی استفادہ نہیں کر سکتے۔ غریب کسانوں کے لئے مباح عام ہوں گے کہ وُہ ان پر قابض ہو جائیں۔ یا اگر حکومت چاہے گی تو ایسے رقبوں پر قابض ہو کر اپنے انتظام سے ان کی آبادکاری کی کوئی اسکیم اختیار کر لے گی۔

نجی جنگلات اور چراگاہیں بہت سی جاگیریں اور زمینیں نجی جنگلات اور چراگاہوں کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں، حالانکہ شرعاً جنگلات اور چراگاہیں صرف خدا تعالیٰ کے لئے (اس کی نیابت کرنے والی حکومت کے ذریعے) مخصوص ہو سکتی ہیں، لیکن کسی شخص کو ذاتی طور پر جنگل اور چراگاہ کو مخصوص اور احاطہ بند کرنے کا حق نہیں ہے۔ اور قانوناً اس قسم کی احاطہ بندیوں اور قدغنوں کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی فقہ کا یہ قانون بھی بے شمار جنگلات اور چراگاہوں کو خاص ملکیتوں سے نکال کر عوامی ملکیت میں لا سکتا ہے اور معاشی ناہمواریوں کے دُور کرنے میں اس سے کافی مدد لی جا سکتی ہے۔

مزارعین کے حقوق مندرجہ بالا تدابیر کے اختیار کرنے سے زمینداروں کی خدائیاں بڑی حد تک کمزور پڑ جائیں گی اور مزارعین اس قابل ہو سکیں گے کہ بے نیازانہ طور پر محنت کر کے اپنا حق وصول کریں لیکن پھر بھی مزارعین کو اسلام کے منشا کے مطابق پورے حقوق دلانے کے لئے خاص تدابیر اختیار کئے بغیر کام نہ چلے گا۔

آج ہمارے ہاں کے کاشت کار کی ایک ہی مشکل نہیں ہے

کہ وُہ پوری محنت کرنے کے باوجود زندگی کی کم سے کم ضروریات تک فراہم نہیں کر سکتا، بلکہ اسے زمیندار کی خداوندی کے سامنے ایک ذلیل قسم کی غلامی و عبودیّت کی زندگی گذارنی پڑتی ہے۔ اسے ناروا قسم کے ٹیکس دینے پڑتے ہیں، اسے بیگاریں دینی ہوتی ہیں۔ اسے اپنے اسلامی حقوقِ اخوّتِ و مساوات ہی نہیں عام انسانی شرف و آبرو تک زمیندار کی نذر کرنی پڑتی ہے، اسے پیٹھ پر کوڑے کھانے پڑتے ہیں، اسے جھوٹے مقدمات میں مبتلا کیا جاتا ہے، اسے بلا کسی نوٹس کے بیک بینی و دو گوش زمینداری کی حدود سے نکال باہر کیا جاتا ہے اس کی بہو بیٹیوں کو اغوا کر لیا جاتا ہے، اور ان کی عصمتوں سے کھلم کھلا چھیڑ چھاڑ کی جاتی ہے۔ یہ حالات ایسے دردناک ہیں کہ ان کو دیکھ کر بہت سے نوجوان اپنا ذہنی توازن برقرار نہیں رکھ سکتے اور اُن کو انصاف کی راہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ زمینداروں سے زمین چھین کر انہی مزارعوں کے حوالے کر دی جائے جن کے لئے وُہ ظلم کا ذریعہ بنی ہوئی ہے۔

لیکن ہم ایک مسلم کا ذہنی توازن برقرار رکھتے ہوئے مزارعین

کو ان کے جائز حقوق کے واپس دلانے کی جائز تدابیر اختیار کرنے کے پابند ہیں۔ مزارعین کے اسلامی حقوق ان کو واپس دلانے کیلئے اوّلین ضروری تدبیر یہ ہے کہ معاوضہ محنت کے لئے اسلام کے "اصولِ کفالت" کو قائم کر دیا جائے، یعنی جس کی پوری محنت لی جا رہی ہو اس کا کم سے کم معاوضہ اتنا ہونا چاہیئے کہ اس کی اور اس کے کنبے کی بنیادی ضروریات پوری[1] ہو سکیں۔ زمین کی کاشت سے تعلق رکھنے والے کاموں کے علاوہ کسان سے کوئی دوسرا کام اس کے رضاکارانہ فیصلے کے بغیر یا اسے معقول معاوضہ دیئے بغیر نہ لیا جا سکے بلکہ اس طرح کی زائد خدمات اور بیگاریں لینا فوجداری جرم قرار پا جائے۔ اگر کوئی زمیندار مارپیٹ کرے تو اسلام کے اصولِ عدل کے مطابق مظلوم کے ہاتھ سے خود اس کو پٹوا دینا اسلامی حکومت پر لازم ہو۔

---

[1] ایک اسلامی حکومت زمیندار اور کسان میں پیداوار کی تقسیم کا تناسب بغرضِ اصلاح قانوناً بھی متعین کر سکتی ہے، لیکن ایسی تدابیر صرف اسی وقت تک اختیار کی جا سکتی ہیں جب تک کہ ادائے حقوق کا احساس پیدا نہ ہو جائے۔ عام حالات میں مسلمانوں کو "علیٰ اثرہم" کی حالت میں آزاد چھوڑ دینا چاہیئے۔

کسان سے پیداوار کے مقررہ حصے کے سوا کسی قسم کے ٹیکس کی وصولی کا زمیندار کو کوئی حق حاصل نہ رہے۔

علاوہ بریں اس بات کا اہتمام کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ زمینداروں اور مزارعین کے درمیان سارا معاملہ تحریراً ہو اور معاملہ کی ضروری شرائط قلمبند (بلکہ "رجسٹرڈ") ہو جائیں، نیز فریقین کا معاہدہ ایک متعیّن مدّت کے لئے ہو، تاکہ ایک کسان ناگہانی طور پر بے دخل کئے جانے کے خطرے سے آزاد ہو سکے! اس ضمن میں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ اسلام "موروثی کاشت کاری" اور موروثی قبضہ کے خاص حقوق کا مخالف نہیں، بلکہ قرونِ اولیٰ میں ان حقوق کو قانوناً تسلیم کیا جا چکا ہے۔ مفتوحہ علاقوں کی زمینیں اسلامی حکومت کی مِلک قرار پاگئی تھیں، جیسے عراق وغیرہ میں، لیکن ذمّی رعایا کا قبضہ بہ حیثیت موروثی کاشتکاروں کے ان پر بحال رکھا گیا۔ پس آج بھی کاشتکاروں کا حقِ موروثیت مانتے ہوئے ان کو بلا وجہ معقول (جنہیں قانوناً متعین کرنا ہو گا) بے دخل کرنا جائز نہ ہو گا۔ اس قسم کے موروثی حقوق کی خرید و فروخت بھی ناجائز قرار نہیں دی جا سکتی اور یقیناً یہ حقوق ایک شخص کے ورثا میں

منتقل ہو سکیں گے۔

مادّی حقوق کو بحال کرنے کی ان تدابیر کے ساتھ ساتھ مزارعین کے اخلاقی حقوق کو بحال کرنے کے لئے اُن میں اسلامی ذہنیت کے پیدا کرنے اور اُن کی کچلی پسی ہوئی خودی کو چونکانے کے کام میں ایک عرصے تک تعلیم بالغاں کے مختلف ذرائع سے مدد لینی پڑیگی، یہاں تک کہ وہ اپنے شرف کا احساس کریں اور روٹی کمانے کے لئے اپنی عزت میں کسی کمی کو گوارا نہ کریں۔ اس تعلیم و تربیت کی کامیابی صرف اسلامی حکومت کے سائے میں یقینی ہو سکتی ہے جس کا بیت المال ہر وقت ایسے کسانوں کی کفالت کے لئے تیار رہے گا جن کو اپنے اسلامی حقوق سے ہاتھ دھوئے بغیر روٹی ہاتھ نہ آسکے۔ لیکن اپنے خداداد اسلامی حقوق میں وہ کوئی کمی کرنے پر راضی نہ ہوں۔ ہمیں اپنے مزارعین کو یہ سکھانا ہوگا کہ وہ زمیندار کو تنے ہوئے قد کے ساتھ مسلمانوں کی طرح السلام علیکم کہہ سکیں، وہ نماز میں کسی جھجک کے بغیر اس کے برابر کھڑے ہو جائیں اور وہ اس کے رُوبرو برابر سرابر کی ایک آبرو مندانہ نشست پر بیٹھ سکیں۔ وہ اس کی غلطیوں پر کھلم کھلا اسے ایک مسلم کی طرح ٹوک سکیں اور احکامِ خداوندی اور سُنتِ نبوی کی تبلیغ اسکی آنکھوں

میں آنکھیں ڈال کر کر سکیں۔ یہ تربیت اگر حکومت کے ذرائع و وسائل سے ہو تو چند سال میں زمیندار کا نشۂ خدائی ہوا ہو سکتا ہے۔ اور اسے محسوس کرایا جا سکتا ہے کہ آنجناب کا مقام خدا کے بندوں ہی کی صف میں ہے۔

۳۔ سرکاری ملازمین کے معاوضے

ہمارے نظامِ معاشی کی بڑی بڑی ناہمواریوں میں سرکاری ملازمین کے معاوضوں کی اونچ نیچ کو اوّل درجے کی اہمیت حاصل[1] ہے۔ تنخواہوں کا

---

[1] حکومت چونکہ انسانی قوت (Man-power) اور جنسِ محنت (Labour) کی سب سے بڑی گاہک ہوتی ہے، اس وجہ سے قدرتی طور پر محنت اور ملازمت کے معاوضوں کا جو بازاری نرخ (Market Rate) بنتا ہے اس پر حکومت کی اختیار کردہ شرح ہائے معاوضہ اور اصولِ معاوضہ بندی بہت ہی گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ انسانی محنت کا منصفانہ نرخ کسی ملک میں صرف اسی صورت میں رائج ہو سکتا ہے جبکہ حکومت سب سے پہلے اپنی تنخواہوں کا نظام انصاف کے اصولوں پر عملاً قائم کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں نظامِ معیشت کو رائج کرنے کے لئے تنخواہوں کی فوری اصلاح کو ہم لازم سمجھتے ہیں۔

خوفناک تفاوت تنہا ہی نہیں پایا جاتا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ملازمین میں ایک مہلک طبقہ بندی بھی کار فرما ہے، اوپر کے طبقے میں کبر و رعونت کا احساس پایا جاتا ہے اور نچلے طبقے کے کثیر التعداد ملازمین کے اندر احساسِ کہتری کا مرض پیدا کر دیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک حکومت کے کارکنوں کو مملکت اور عوام کی خدمت کے لئے ایک ٹیم کی طرح کام کرنے میں جس جذبۂ اخوت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مر چکا ہے ——— اور ظاہر ہے کہ اگر آپ یہاں اسلامی حکومت قائم کرنے چلے ہیں تو اس صورتِ حالات کو باقی نہیں رکھا جا سکے گا، بلکہ اسے جلد از جلد بدل دینا ہوگا۔

تین بنیادی قباحتیں | موجودہ معاوضہ بندی میں بنیادی قباحتیں تین ہیں۔ پہلی خرابی یہ ہے کہ کم سے کم درجے کی جو تنخواہ طے کی گئی ہے، وہ ایسی نہیں ہے کہ جس میں ایک کنبے کا تو کجا ایک فرد کا گذارہ بھی ہو سکے۔ آخر کوئی ریاضی دان یہ بتائے کہ ۳۵ روپیہ ماہانہ میں روٹی، کپڑا، مکان

لہ یہ تو گورنمنٹ کے ملازمین کے معاوضوں کی کم سے کم حد بندی ہے، ان کے مقابلہ میں ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپل کمیٹیوں اور لوکل سیلف گورنمنٹ کے دوسرے اداروں کے بعض ملازمین کی بنیادی تنخواہیں ۱۹ - ۱۹ اور ۲۰ - ۲۰ روپے بھی ہیں۔ یہ کھلا ہوا ظلم ہے۔

اور دوا جیسی ضروریات ایک، دو، تین، چار، پانچ اور دس افراد کے کنبے کے لئے کیسے پوری ہو سکتی ہیں۔ پھر اس سے اوپر ۴۰، ۵۰، ۶۰ اور ۸۰ تک کے جو معاوضے پائے جاتے ہیں، ان کو چار پانچ افراد کے کنبوں کی کفالت کا ذریعہ کس حکمت سے بنایا جا سکتا ہے؟ جس کمیشن کے ممبران نے یہ ظالمانہ شرح بندی کی ہے، ہم اس کے ارکان سے سوال کرتے ہیں کہ کیا آپ ایک مہینہ اپنے گھر کا خرچ اسی رقم سے چلا کر دکھا سکتے ہیں؟ اگر اپنے گھر کا نہیں، تو کیا آپ -/۳۵ روپے لینے والے کارکن کو کوئی ایسا بجٹ بنا کر دے سکتے ہیں کہ جس کے ذریعے اُسکے ۷۵ روپے کے مصارف -/۳۵ روپے میں پورے ہو جائیں۔ اگر آپ کی معاشی معلومات میں ایسے کوئی چھومنتر نہیں ہیں تو پھر بتائیے کہ آپ خُدا کے سامنے کیا جواب دیں گے، اور اگر آپ خدا کو نہ مانتے ہوں تو فرمایئے کہ آپ نے اپنے ضمیر کو کس طرح مطمئن کر لیا ہے[1]؟

---

[1] ایک صحیح اسلامی حکومت کی آزاد عدالت میں حکومت کا ایک کارکن اس قسم کے ظالمانہ معاوضہ کے خلاف احتجاجی استغاثہ دائر کر سکتا ہے اور عدالت یقیناً حکومت کے خلاف ڈگری دے کر اسے معقول معاوضہ دلا کر رہے گی۔

دوسری خرابی تنخواہوں کی شرح بندی میں یہ ہے کہ ایک کارکن کے کنبے اور اس کی معاشی ذمہ داریوں کا سرے سے کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا ان حالات میں دیکھا جاتا ہے، کہ ایک طرف ایک شخص فردِ واحد ہو کہ تین چار سو روپیہ ماہانہ لے رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف دس افراد کا کنبہ پچاس روپلی پر پل رہا ہوتا ہے۔

تیسری خرابی معاوضوں کے موجودہ سسٹم میں ظالمانہ تفاوت کا پایا جاتا ہے۔ آج ہمارے ہاں کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ تنخواہ کی باہمی نسبت ۱ : ۱۰۰ کی ہے۔ بلکہ اگر لوکل سیلف گورنمنٹ کے اداروں کے کارکنوں کے معاوضوں کو دیکھا جائے تو تفاوت کا تناسب صریحاً ۱ : ۲۰۰ کا ہے۔ یعنی جو فرق ایک منزل کے مکان اور دو سو منزل کے مکان کو ایک ساتھ بنا کر محسوس کیا جا سکتا ہے، ٹھیک وہی فرق سرکاری ملازمین کے معاوضوں میں پایا جاتا ہے۔ یا یُوں سمجھئے کہ ایک گاڑی وہ ہے جو ایک میل فی گھنٹہ چل رہی ہے اور دوسری گاڑی وہ جو ۲۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے متحرک ہے۔ تفاوت یقیناً ناگزیر ہے، لیکن اگر تفاوت اتنا زیادہ ہو جائے کہ اسلام کی خدمت

کے لئے افسر اور ماتحت اور ادنیٰ ملازم ایک صف میں شانہ بشانہ کھڑے ہونے کے جذبے سے محروم ہو جائیں تو ایسا تفاوت ناقابل برداشت ہے۔

معاوضہ بندی کے ان تین مفسدات کی وجہ سے جو مہلک نتائج پیدا ہو رہے ہیں، ان کا ایک ہلکا سا تصوّر دلا دینا ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ پاکستان کو بنانے میں جن چھوٹے ملازمین نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے مثلاً مدرّس، کلرک، کانسٹیبل، فوجی سپاہی اور سرکاری کارگاہوں کے مزدور وغیرہ جو پاکستان کی گاڑی کے لئے پہیّوں کی حیثیّت رکھتے ہیں، ان میں حد درجہ کی بے اطمینانی پائی جاتی ہے اور مملکت کی خدمت گذاری کے لئے جس ولولہ کی ضرورت ہے وہ اُن کے سینوں میں دم توڑ رہا ہے۔ وہ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ پاکستان کا وجود صرف اُن "بڑوں" کے لئے ہے جو اس کے خزانے سے جتنا رَس چاہتے ہیں آزادی سے نچوڑ لیتے ہیں اور اپنے سے نیچے کے کارکنوں کی حق ماری کرنے کے لئے پُورے اختیارات رکھتے ہیں۔ دوسری واضح خرابی یہ پائی جاتی ہے کہ معاوضوں کی کمی نے رشوت ستانی اور

پبلک کے اموال میں خیانت کرنے کے دروازے چوپٹ کھلوا دیتے ہیں۔ غریب ملازمین کے اندر جو اخلاقی قوت بددیانتی سے روکنے کے لئے کارفرما چلی آرہی تھی اسے فقر و فاقہ نے آہستہ آہستہ کمزور کر دیا ہے۔ اس طرح رشوت ستانی اور خیانت پاکستان کے خزانۂ قوت کو مسلسل برباد کر رہی ہے، جیسے دیمک کسی تختِ طاؤس کو اندر ہی اندر سے چٹ کر جاتی ہے۔ تیسری خرابی یہ ہے کہ ملازمینِ حکومت غیر منصفانہ معاوضوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے بار بار ہڑتالیں کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ان ہڑتالوں کی وجہ سے مملکتِ پاکستان کے خزانۂ قوت میں کمی واقع ہوتی رہتی ہے۔ چوتھی خرابی یہ واقع ہو چکی ہے کہ افسروں اور عام کارکنوں میں نہ صرف یہ کہ اخوت کا تعلق سرے سے نہیں ہے، بلکہ اُلٹا باہمی نفرت اور کشمکش کی صورت پیدا ہو چکی ہے، اور یہ پاکستان کے لئے فالِ نیک بہرحال نہیں۔ پانچویں خرابی یہ ہے کہ معاوضوں کے اس غلط سسٹم کا بہت مضر اثر سالہا سال سے پرائیوٹ فرموں اور اداروں کے ملازمین اور مزدوروں کے معاوضوں کے "مارکیٹ ریٹ" پر پڑ رہا ہے۔

اِن حالات میں ہمارے ملازمین کمیونزم کے جراثیم کو قبول کرنے کے لئے پوری طرح تیار بیٹھے ہیں۔ چنانچہ فوج کی چھاؤنیاں، پولیس لائنز، اور سول دفاتر کے ہر گوشے میں اِن جراثیم کے انجکشن لگانے کی ایک خاموش مہم ملک بھر میں جاری ہے۔ اس مہم کو ناکام بنانے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں ہے کہ معاوضوں کا نظام اسلام کے منصفانہ اصُولوں پر استوار کر دیا جائے۔

خلافتِ راشدہ میں معاوضہ بندی کا اصُول خلافت راشدہ کے دَور کی تاریخ کی چھان بین کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں ملازمینِ حکومت کے معاوضوں کے تعیّن میں یہ خیال بھی رکھا جاتا تھا کہ کارکن کی قابلیّت اور خدمت کی نوعیّت کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جاتا تھا کہ اس کی ضروریات کیا ہیں اور اس کا کُنبہ کتنا ہے۔

ابتدائی دَور میں جب تک اسلامی انقلاب کی تکمیل کے لئے مخالف قوّتوں سے جدوجہد جاری تھی، تنخواہ داری سرے سے نہ تھی، بلکہ ہر شخص اپنے خرچ پر رضا کارانہ خدمات انجام دیتا تھا اور اگر اسٹیٹ کو کوئی آمدنی ہوتی تھی تو وہ کارکنوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ لیکن بعد

ہجری میں جب اسلامی ریاست پوری طرح قائم (Establish) ہو گئی تو باقاعدہ معاوضہ بندی کر دی گئی جس کی تصریح دورِ عمر رضی اللہ عنہ کی تاریخ میں موجود ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنی ایک تقریر میں وظائف کی تقسیم کے لئے چند اہم چیزوں کا لحاظ رکھنے کا اعلان فرمایا تھا:۔

(۱) فالرجل وبلاءہ فی الاسلام	۱۔کسی شخص نے اسلام کے لئے کیا آزمائشیں جھیلی ہیں۔
۲ والرجل وقدمہ فی الاسلام	۲۔کسی شخص نے اسلام کیلئے کتنی سبقت کی ہے۔
۳۔ والرجل وغناءہ فی الاسلام۔	۳۔کوئی شخص اسلام کے لئے کس درجہ کی مشقت کر رہا ہے۔
۴۔ والرجل وحاجتہ فی الاسلامؐ	۴۔کسی شخص کی حقیقی ضروریات کیا ہیں۔

ایک دوسرے موقع پر یہ ٹکڑہ ارشاد فرمایا:۔

۵ والرجل وعیالہٗ فی الاسلام۔	۵۔کسی شخص کا زیر کفالت کنبہ کتنا ہے؟

معمولی غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معاوضہ بندی کے لئے بہترین منصفانہ اصول یہی ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ تقریر مذکورہ بالا کی اصطلاحات اسلامی تحریک کے ابتدائی انقلابی دور سے متعلق ہیں، لیکن اگر ان

سے عام حالات کے لئے اشارات اخذ کئے جائیں تو معاوضہ بندی
میں قابلِ لحاظ امور یہ ہونگے کہ :-

۱ - (ا) ایک شخص نے اسلامی حکومت کے قائم کرنے اور چلانے
کی جدوجہد میں کیا حِصّہ لیا ہے اور کیسی خاص خدمات انجام دی ہیں۔
اور کن کن قربانیوں سے کام لیا ہے ؟

(ب) ایک شخص نے اسلامی حکومت کی خدمت کے لئے اپنے
آپ کو علمی قابلیّت، عملی مشق و تجربہ اور فنی مہارت کے لحاظ سے
تیار کرنے میں کتنی دماغی اور مالی قربانی دی ہے اور عمر کا کتنا حصّہ صرف
کیا ہے ؟

۲ - ایک شخص کتنی مُدّت سے اسلامی حکومت کی خدمات انجام
دے رہا ہے ؟

۳ - ایک شخص کی خدمات کی نوعیّت کیا ہے اور جسمانی اور
دماغی مشقت اس میں کس درجے کی پائی جاتی ہے ؟

۴ - ایک شخص کی حاجات وضروریات کیا ہیں ؟

۵ - ایک شخص کا کنبہ کتنے افراد پر مشتمل ہے ؟

ان سارے امور کا لحاظ معاوضہ و مزدوری مقرر کرنے میں اگر رکھا جائے تو ان کے مجموعے کا نام "اصولِ کفالت" ہے۔ خلافتِ راشدہ میں تنخواہیں اور معاوضے اسی اصولِ کفالت پر ادا ہوتے تھے۔ چنانچہ کسی ملازمِ حکومت کے کنبے میں جہاں ایک بچے کا اضافہ ہو جاتا، اس کا وظیفہ بیت المال سے ادا ہونے لگتا۔ مہاجرین و انصار کی ازواج کو ۲۰۰ سے ۴۰۰ درہم تک کے وظائف ملتے تھے۔

پاکستان میں اس اصولِ کفالت کو نافذالعمل کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ ایک نیا پے کمیشن (Pay Commission) مقرر کیا جائے جو اسلامی ذہنیت کے ساتھ معاوضوں کے نظام کی نظرثانی کرے۔ ہر سرکاری کارکن کو اس کے افرادِ خاندان کے مطابق اس کی پوری ضروریات فراہم کی جائیں، نیز اس کی اور اس کے اہل و عیال کی صحت کی ذمہ داری حکومت اپنے سر لے۔

ظالمانہ تفاوت کا خاتمہ | دوسری اصلاح جو معاوضوں کے نظام میں مطلوب ہے، وہ یہ ہے کہ ۱۶ تا ۳۵ اور ۳۵۰۰ کے ظالمانہ تفاوت کو ختم کیا جائے۔ کارکنوں کی صلاحیتوں، خدمات کی نوعیتوں اور

مناصب کی ذمہ داریوں وغیرہ میں جو تفاوت قدرتی طور پر موجود ہے وہ یقیناً معاوضوں میں ایک حد تک تفاوت پیدا کرتا ہے اور ایسا ہونا چاہئے۔ لیکن آج کا تفاوت اسلامی نظام کے تحت گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

خلافت راشدہ میں بھی تفاوت موجود تھا اور بعض مناصب کے لئے خاص طور پر اونچے معاوضے بھی رکھے گئے تھے، لیکن وہاں اس امر کا اہتمام تھا کہ نیچے کے کارکنوں کا حق مار کر اوپر کے بڑے عہدہ داروں کو عیاشی کے سامان فراہم نہیں کئے جاتے تھے بلکہ سب سے نیچے والے کو بھی اتنا ضرور ملتا تھا جتنا ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہو۔

خلیفۂ اوّل کے دور میں باقاعدہ تنخواہ دارانہ نظام نہیں تھا، خلیفۂ دوم نے اسے قائم کیا اور ۱۵ھ میں جب باقاعدہ طور پر ملت اسلامیہ کے جملہ افراد کو سرکاری سپاہ قرار دیکر درج رجسٹر کرایا تو ان کے مستقل معاوضے مقرر فرمائے۔ ان معاوضوں میں زیادہ سے زیادہ کی مقدار ۵۰۰۰ درہم (موجودہ شرح کے حساب سے قریباً ۲۵۰۰ روپیہ) اور کم سے کم مقدار ۲۰۰ درہم (۱۰۰ روپیہ) تھی[۱]۔ بعد میں جب اسلامی ریاست کے

---

[۱] سول محکموں میں سے صوبہ کے گورنروں کی تنخواہیں بھی ۵۰۰۰ درہم ماہانہ تھیں۔
(باقی دیکھیں ص ۱۸۱ پر)

مالیات نے مزید ترقی کی تو ان تنخواہوں میں اور اضافہ کیا گیا۔ ایک طرف افسروں کی تنخواہوں کو ۱۰ ہزار درہم تک بڑھایا گیا اور دوسری طرف کم سے کم معاوضہ پانے والوں کو ۲۰۰ کے بجائے ۳۰۰ درہم دیئے جانے لگے۔ گویا اسلامی نظام میں ایک ادنیٰ سے ادنیٰ چپراسی اور ہرکارہ اور سنتری بھی ۱۵۰ روپیہ ماہانہ پاتا تھا (بیوی بچوں کے لئے وظائف مزید براں ملتے تھے) غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ خلافتِ راشدہ میں معاوضوں کا تفاوت ۱ : ۲۵ اور ۱ : ۳۳ کے اندر اندر قائم رہا ہے، اس کے مقابلے میں آج کے پاکستان میں تفاوت ۱ : ۲۰۰ کا ہے، یعنی ۶ اور ۸ گنا!

یہ انصاف کی قطعی نفی ہے کہ ہماری حکومت کی گاڑی جن پہیوں پر چلتی ہے اُن کو تو حد درجہ ناکافی معاوضے دیئے جائیں لیکن پاکستان کے اس خزانے سے جسے ملک کے غریب لوگ اپنے خون پسینے کی ایک ایک بوند ٹپکا ٹپکا کر بڑی مشکلوں سے بھرتے ہیں، بڑے عہدہ داروں کو نہ صرف

(بقیہ حاشیہ صفہ ۱۸۰)۔ بڑے درجے کے قاضیوں (ججوں) کی تنخواہیں جو خاص طور پر زائد رکھی گئی تھیں تاکہ رشوت ستانی کوئی رخنہ انصاف کے محل میں پیدا نہ کر سکے، وہ ۵۰۰ درہم ماہانہ (یعنی قریباً ۲۵۰ روپے) مقرر ہوئیں۔ قاضی سلیمان ربیعہ اور قاضی شریح کو یہی مشاہرہ ملتا تھا۔

یہ کہ ساری ضروریاتِ زندگی پوری کر کے دی جاتی ہیں، بلکہ ان کی معصیت بھری تفریحات، ان کی عیاشیوں، ان کی کافرانہ عادات، ان کی غیر اسلامی مجالسِ کیف و سرور کے مصارف پورا کرنے کے لئے معاوضوں میں پوری طرح گنجائشیں رکھی جاتی ہیں۔ پاکستان کے غریب خزانے کے بل پر شرابیں خریدی جاتی ہیں۔ کلب گھروں میں رقص و سرود کے ہنگاموں سے لذّت اندوزی کی جاتی ہے، برج کھیلی جاتی ہے، گھوڑ دوڑ میں روپیہ لگایا جاتا ہے، اپنی عورتوں کو تبرّجِ جاہلیت سے آراستہ کر کے بے پردگی اور بے حیائی کی تبلیغ کے لئے میدان میں لایا جاتا ہے — اور پاکستان کی گاڑی کے پہیّے — مدرّس، کلرک، سپاہی، کانسٹیبل، مزدور وغیرہ "چہ خورد بامداد فرزندم" کا معمّا حل کرنے میں اپنا خون خشک کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ گھس گھس کر اور گھل گھل کر ختم ہو جائیں۔

ایک اسلامی حکومت کے لئے لازم ہے کہ وہ پہلے اُوپر کے افسروں کی نہیں، پہلے نیچے کے کارکنوں کی کم سے کم شرح کو اصولِ کفالت کے مطابق طے کرے کہ ایک کنبے کی گذران کے لئے کتنی رقم دینا ناگزیر ہے، پھر بعد میں یہ دیکھا جائے کہ اُوپر کے اعلیٰ کارکنوں کو خاص اضافے

دینے کے لئے خزانہ کتنی گنجائش رکھتا ہے، نہ یہ کہ پہلے اوپر کے معاوضے مقرر ہو جائیں اور پھر خزانے میں جتنی استطاعت باقی رہے، نچلے ملازمین کی تنخواہیں اس کے مطابق ادا ہونے لگیں۔ صرف اسی طریق سے تفاوت کو معقول اور جائز تناسب پر قائم کیا جا سکتا ہے۔

نبی صلعم کی واضح ہدایت | نبی صلعم نے اپنے دورِ حکومت میں معاوضہ بندی کا جو قاعدہ اختیار فرمایا تھا، وہ تاریخ و حدیث میں ان الفاظ کے ساتھ مذکور ہے:۔

من کان لنا عاملاً فلیکتسب زوجۃ فان لم یکن لہ خادم فلیکتسب خادماً وان لم یکن لہ مسکناً فلیکتسب مسکناً۔ من اتخذ غیر ذالك فھو غال او سارق (شک من الراوی)

(ابوداؤد، کتاب الخراج)

جو ہمارا (حکومت کا) ملازم ہو، اگر اس نے شادی نہ کی تو شادی کر لے، اور اگر اس کے پاس کوئی خادم نہ ہو تو خادم رکھ لے، اور اگر اس کے پاس مکان نہ ہو تو مکان بنوا لے۔ جو اس حد سے آگے بڑھے وہ خائن ہے یا چور ہے۔ (راوی کو اس میں شک رہا کہ دونوں میں سے وہ لفظ فرمایا یا یہ)

یہ حدیث معاوضہ بندی کے دو بنیادی اصول واضح کر دیتی ہے۔ ایک یہ کہ ایک ملازم کی حقیقی ضروریات کو پورا کرنا حکومت کا فرض ہے۔ دوسرے یہ کہ حقیقی ضروریات سے زائد خزانۂ سرکاری سے وصول کرنا بددیانتی ہے۔

یہ دونوں اصول اِس ظالمانہ تفاوت کی جڑ پہ کلہاڑے کی سی ضرب لگاتے ہیں جو ہمارے ہاں رائج ہے۔

اکابرِ حکومت کے معاوضے | اب تک عام ملازمین کے معاوضوں کے متعلق جو اشارات بیان کئے گئے ہیں، اسلامی نظام میں اکابرِ حکومت کا معاملہ ان سے بالکل الگ ہے۔ اکابرِ حکومت سے صدرِ حکومت، وزرا اور ارکانِ اسمبلی وغیرہ خدّامِ ملک مراد ہیں۔ جدید جمہوری نظام میں ان عہدوں کے ساتھ بھاری تنخواہیں رکھی جاتی ہیں، لیکن اسلامی نظام میں ان مناصب کے لئے تنخواہ اور ملازمت کے تصوّر کو موجبِ توہین سمجھا جاتا ہے اور بجائے تنخواہ کے ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کے لئے ایک اوسط درجے کے معیار کے مطابق وظائف مقرر کئے جاتے ہیں۔

خلافتِ راشدہ میں خلفاء اور اہلِ شوریٰ نے گذارے کے وظائف سے زائد کبھی کچھ وصول نہیں کیا، بلکہ خلیفۂ اوّل نے زندگی بھر جتنا وظیفہ لیا تھا، اسے بھی اپنے ترکہ میں سے واپس بیت المال میں داخل کرنے کی وصیّت کی۔ حضرت عمرؓ نے واضح طور پر اپنے وظیفہ کی حیثیت متعیّن کر دی کہ:۔

انما انا ومالکم کوالی الیتیم ان استغنیت به استعفف وان افتقرت اکلت بالمعروف۔	تمہارے بیت المال کے لئے میری وہی حیثیت ہے۔ جو یتیم کے والی کی ہوتی ہے۔ پس میں اگر غنی ہوں گا تو اس میں سے کچھ نہ لوں گا اور اگر ضرورت مند ہوُا تو منصفانہ طریق سے کھا لوں گا۔

چنانچہ یہ منصفانہ معاوضہ جو اخراجات کا باقاعدہ حساب مرتب کر کے آپ نے مقرر فرمایا تھا دو درہم روزانہ (= عنہ) تھا۔ پھر اس پر احتیاط کی شدّت کا یہ عالم تھا کہ بیت المال کا ذرا سا حق بھی اپنے اوپر آنے کے روادار نہ تھے۔ اور اپنے اوپر اور گھر والوں پر اس معاملے میں حد درجہ کی سختی کرتے تھے، یہی مسلک حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے

اختیار کیا۔ جنہیں بنو امیہ کے دور کے بیچ میں دو سال کے لئے خلافتِ راشدہ کے احیاء کا موقع مل گیا تھا۔

لیکن آج "مالِ یتیم" کے والیوں کا یہ حال ہے کہ اپنے لئے ۵،۵ ہزار روپیہ تک کی تنخواہیں مقرر کرتے ہیں، تنخواہوں سے بڑھ چڑھ کر سفر خرچ وصول کرتے ہیں، شاہانہ ضیافتوں اور دعوتوں کے لئے روپیہ صرف کرتے ہیں، ۶۰، ۶۰ ہزار روپیہ کا فرنیچر استعمال کرتے ہیں۔ اور اپنے مناصبِ خدمت کو باقاعدہ کمائی اور عیاشی کا ایک وسیلہ سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

مدعا یہ نہیں کہ آج بھی معاوضہ عین دو درہم روزانہ ہی ہونا چاہئے بلکہ موجودہ دور کے معیارِ تمدن کے پیشِ نظر ایک اوسط درجے کے شہری کی صاف ستھری شریفانہ مگر سادہ زندگی گزارنے کے لئے جتنا خرچ ناگزیر ہے، پاکستان کے صدرِ حکومت، اس کے وزرا اور اس کے ارکانِ اسمبلی کو صرف اسی پر اکتفا کرنا چاہئے۔ ورنہ مالِ یتیم کے والی سے عدالتِ خداوندی میں جتنا شدید محاسبہ ہونا ہے، اس سے ہزار گنا زیادہ شدید محاسبہ ایک اسلامی حکومت کے عناں برداروں سے ہوگا۔

اعلیٰ عہدہ داروں پر ایک اہم پابندی موجودہ نظام میں اعلیٰ عہدہ داروں کو پوری چھوٹ ہے کہ وہ اپنی بڑی تنخواہوں کے بل پر نہایت درجہ ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی بسر کریں اور اپنے مُسرفانہ معیارِ زندگی کو عوام ملک اور ماتحت کارکنوں سے بالاتر ہو کے رہنے کے لئے ذریعہ بنائیں۔ بڑے افسروں کی اس آزادی سے کئی فتنے اُٹھتے ہیں:۔ اوّلاً ہر اُونچا عہدہ دار اپنے دماغ میں رعونت کو پرورش دیتا ہے اور ماتحت ملازمین کو اور پبلک کے افراد کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ثانیاً وزیروں، گورنروں، کمشنروں، محکموں کے ڈائرکٹروں اور دوسرے بڑے افسروں کا ٹھاٹھ باٹھ اس امر میں روک بن جاتا ہے کہ ماتحت ملازمین اور پبلک اپنی ضروریات اور شکایات کو اُن تک پہنچا سکیں۔ ثالثاً بڑے افسروں کے ٹھاٹھ باٹھ کو دیکھ کر ماتحت کارکنوں میں اسراف کا ذوق بیدار ہونے لگتا ہے۔ ان کی تنخواہیں جب اس ذوق کی تسکین کے لئے کافی نہیں ہوتیں تو پھر وہ رشوت ستانی وغیرہ سے مدد لیتے ہیں۔ رابعاً حکومت کے اکابر اور عہدہ داروں کا مُسرفانہ رویّہ پوری پبلک کو اسراف کی ترغیب دلاتا ہے۔ اِن سارے فتنوں سے

بچنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ کارکنانِ حکومت کو مجبور کیا جائے کہ وہ ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی کو چھوڑ کر عام لوگوں کی طرح کا رہن سہن رکھیں اور خدا کے بندوں کو اپنے تک پہنچنے کے لئے سہولتیں بہم پہنچائیں۔

اس معاملے میں بھی خلافت راشدہ کے دورِ مقدس سے ہمیں واضح اور قطعی رہنمائی ملتی ہے۔ وہاں تو نبی صلعم نے اپنے اسوۂ حسنہ سے اوّل روز سے ہی ایسی مستحکم روایات قائم کر دی تھیں۔ جن سے روگردانی کرنے کی جرأت کسی کو نہ تھی۔ آنحضرت کے بعد آپ کے خلیفۂ اوّل نے ان روایات کی پوری طرح پاسداری کی، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے اسلامی حکومت کے اعلیٰ کارکنوں کے معیارِ زندگی کے متعلق ایک مستقل ضابطہ بنا دیا۔ آپ دورِ عمرؓ کے "ضابطۂ خدماتِ ملّی" (Public Services Code) کا اگر جائزہ لیں تو اس میں ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی کے خلاف واضح امتناعی احکام ملیں گے۔

ایک خطبہ میں حضرت عمرؓ نے عمّال کو ہدایات دیں کہ :۔

الا وانی لم ابعثکم امراء سمجھ لو! کہ میں نے تم کو حکمران اور سخت گیر

ولا جبارين ولكن بعثتكم ائمة الهدى يهتدى بكم، فادروا على المسلمين حقوقهم، ولا تضربوهم فتذلوهم ولا تحمدوهم فتفتنوهم ولا تغلقوا الابواب دونهم فيأكل قويهم ضعيفهم ولا تستأثروا عليهم فتظلموهم

بنا کے نہیں بھیجا ہے، بلکہ تمہیں بطور ائمہ ہدایت مقرر کیا ہے تاکہ لوگ تمہارے ذریعے ہدایت پائیں۔ پس:

۱۔ مسلمانوں کے حقوق ادا کرو

۲۔ ان کو زدوکوب نہ کرو کہ وہ ذلیل ہو جائیں۔

۳۔ ان کی تعریفیں[1] نہ کرو کہ وہ غلط فہمی میں پڑ جائیں۔

۴۔ ان کے لئے اپنے دروازے بند نہ کرو کہ طاقتور کمزوروں کو کھا جائیں۔

۵۔ اُن کے مقابلے میں اپنے آپ کو ترجیح نہ دو کہ اس طرح اُن پر ظلم کرنے لگو گے۔

---

[1] جاہ پرست حکام رائے عام کو ساتھ ملا رکھنے کے لئے بالعموم عوام کی ایسی تعریفیں کیا کرتے ہیں جن کا استعمال ہی خود بتا دیتا ہے کہ یہ لوگوں کو بیوقوف بنانے کے سیاسی ہتھکنڈے ہیں۔ اسی چیز سے روکا گیا ہے

اس خطبہ میں پانچویں ہدایت کا جو کچھ منشا ہے، اس کی تفصیل ان شرائط سے طے ہو سکتی ہے جو حکّام و عمّال کے پروانۂ تقرری میں درج کی جاتی تھیں اور بالعموم مجمع عام میں ان کی پابندی کے لئے عہد لیا جاتا تھا۔ وہ شرطیں یہ تھیں کہ ترکی گھوڑے پر سواری نہ کروگے، باریک کپڑے نہ پہنوگے، میدے کی روٹی نہ کھاؤگے، دروازے پر دربان نہ رکھوگے اور اہلِ حاجت کے لئے اپنے دروازے ہمیشہ کھلے رکھوگے۔

اس دور میں ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی کے یہی مظاہر تھے اور ان کو اسلامی حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کے لئے قانوناً ممنوع ٹھہرایا گیا تھا۔

چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعری جیسے جلیل القدر کارکن کے خلاف ایک مرتبہ دربارِ خلافت میں کچھ شکایات آئیں تو ان میں سے ایک یہ تھی کہ ان کے پاس ایک لونڈی ہے جس کو ایسی غذا ملتی ہے جو عام مسلمانوں کو نصیب نہیں ہوتی[1]۔ اتفاق سے باقی الزام غلط

---

[1] آج کتنے ہی کارکنانِ حکومت ایسے ہوں گے جن کے کتّوں کو عام مسلمانوں (باقی صفحہ ۱۹۱ پر)

نکلے اور یہی ایک صیحح ثابت ہُوا۔ عدلِ عمرؓ نے لونڈی اُن سے الگ کرا دی۔

ایک مرتبہ عیاض بن غنم عاملِ مصر کے متعلق اطلاع ملی کہ وہ باریک کپڑے بھی پہنتے ہیں اور دروازے پر دربان بھی ۔ ۔ ۔ ۔ رکھتے ہیں۔ عاملِ موصوف کو مرکز میں پکڑ بلوایا گیا، عین اس حال میں کہ باریک لباس بدن پر موجود تھا۔ حضرت عمرؓ نے وہ لباس اُتروا کر گڈریوں کا اُونی جبّہ پہنوایا اور کہا کہ جاؤ تم جنگل میں بکریاں چراؤ، انسانوں پر حکومت کرنے کے تم اہل نہیں ہو۔ آخر صدقِ دل سے توبہ کرنے پر اُن کو منصب پر بحال کیا گیا۔

اسی طرح کوفہ میں سعد بن وقاص نے اپنے لئے ایک عالیشان مکان بنوایا جس میں ڈیوڑھی بھی تھی۔ خلیفۂ ثانی کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اس ٹھاٹھ کی تعمیر کو اہلِ حاجت کے لئے روک سمجھا اور محمد بن مسلمہؓ کو مامور کیا کہ جاؤ اس ڈیوڑھی کو جا کر آگ لگا دو، چنانچہ اس فرمان کی تعمیل ہوئی اور سعد بن وقاص چپکے بیٹھے دیکھتے رہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۰) سے کئی گنا بہتر غذائیں اور دوائیں ملتی ہوں گی، لیکن کوئی عمرؓ موجود نہیں جو اس صورتِ حالات کو بدل دے۔

آج کے دور کے لئے ان روایات سے جو چیزیں اخذ ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ حکام و عمّال کو سرکاری ڈیوٹیوں کی انجام دہی کے لئے تو اعلیٰ سے اعلیٰ ذرائع و وسائل مہیّا ہونے چاہئیں، لیکن ان کو شخصی اور گھریلو زندگی کے معیار کو کبر اور اسراف کی حد تک جانے سے قانوناً روکا جانا چاہئے۔ ایک مسلم مملکت کے حکام کا مقام یہ نہیں ہے کہ وہ قالینوں اور صوفوں کی جنّتیں بسا کے بیٹھیں، نوکروں اور خادموں کے بیڑے بھرتی کریں، زندگی کے چند لمحے بسر کرنے کے لئے اونچے ایوان تعمیر کرائیں، اور لمبے چوڑے احاطے گھیر کر بیٹھیں، رقص و سرود کے ہنگاموں سے لذت اندوز ہوں اور شرابیں پئیں۔ وہ سفر کو نکلیں تو ہزاروں کارکن مختلف انتظامات میں مصروف ہو جائیں، وہ جہاں قیام کریں وہاں پولیس کے پہرے ہوں اور سی، آئی، ڈی کے کارکن موہوم خطرات کو سونگھتے پھریں۔ وہ کسی سڑک سے گزریں تو وہ سڑک پبلک کے لئے حرام ٹھہرا دی جائے، وہ اگر کسی تقریب میں شریک ہوں تو ان کے لئے آرائشی دروازے نصب کئے جائیں، جھنڈیاں لگائی جائیں اور لمبے

اور حلوان کے تھان زمین پر بچھا دیئے جائیں، وہ کسی مجلس میں تشریف لائیں تو نعرے لگائے جائیں اور خوشامدانہ سپاسنامے ان کی خدمت میں پیش کئے جائیں، کوئی غریب حاجت مند ان سے ملنے کی کوشش کرے تو اسے روکنے کے لئے قدم قدم پہ رحم ہاتھ موجود ہوں کسی اسلامی حکومت کے کارکن اگر اس روش پہ چلیں تو ان کو یقیناً سزا ملنی چاہئیے۔

اس مصنوعی زندگی سے جب تک ہمارے حکّام الگ نہ ہو جائیں ان کے دماغوں سے کبر و رعونت کی وہ ہوا نکل ہی نہیں سکتی جو غریب عوام اور ماتحت ملازمین کے لئے اُن تک پہنچنے میں مانع ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر اسلامی اخوّت و مساوات کا احساس پیدا ہونے ہی نہیں پاتا۔ اسلامی نظام میں بہر حال کارکنانِ حکومت کے لئے کبر و رعونت اور اسراف و تبذیر کی زندگی بسر کرنے کا موقع مہیا نہیں کیا جا سکتا اور نہ حکّام کو کارکنوں اور پبلک سے الگ ایک "عالمِ بالا" میں رہنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

اسلامی حکومت اپنے عمّال و حکام سے یہ چاہتی ہے کہ وہ اپنے ماتحت کارکنوں اور عام شہریوں کے لئے نہ صرف یہ کہ اپنے دروازے

کھُلے رکھیں، بلکہ ایک عام مسلمان کی طرح ان سے روابط قائم کریں، یہاں تک کہ خلیفۂ دوم کے دَور میں ایسے حکّام و عاملین کو برطرف کر دیا جاتا تھا جو بیمار مسلمانوں کی عیادت کو نہ جائیں۔ پس یہاں اس طرزِ عمل کا کوئی موقع نہیں ہے جو آج رائج ہے کہ ہمارے اکابرِ حکومت اور حکّام وعمّال نہ مسجدوں میں جائیں، نہ عوام سے ملیں جُلیں، نہ لوگوں کی مشکلات کو براہِ راست جا کر معلوم کریں، نہ اپنے دروازے ہر خاص و عام کے لئے کھُلے رکھیں، بلکہ اِن کو جن شکایات اور ضروریات کا علم ہو بھی جائے، ان کے بارے میں اپنا فرض ادا کرنے پر اُس وقت تک تیار نہ ہوں، جب تک کہ پریس اور اسٹیج سے ایک طوفان پبلک کی طرف سے بپا نہ کر دیا جائے۔

۴۔ حقوقِ محنت کا تحفّظ

معاشی ناہمواریوں کو پیدا کرنے والے اسباب میں سے ایک اہم ترین سبب صنعتی مزدوروں کی حق ماری ہے۔ ہمارے صنعتی مزدوروں کا حال یہ ہے کہ وہ سرمائے کے نخاس میں اپنے آپ کو بردے اور

غلام بنا کر بیچتے ہیں، اور نہایت ارزاں بیچتے ہیں۔ خریدنے والے ان ابنائے آدم کو خرید کر چوپایوں کی طرح استعمال کرتے ہیں جیسے کوئی شتربان بہت سے اونٹ پال لیتا ہے یا کوئی حمّال گدھے خرید لیتا ہے اور پھر ان سے روپیہ کما کر ان پر کم سے کم صرف کرتا ہے اور اپنے لئے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح ہمارے کرخندار انسانوں کے گلّے کے گلّے پال کر ان کو کمائی کا ذریعہ بناتے ہیں اور پھر اس کمائی میں سے وہ کم سے کم حصّہ ان پر صرف کرتے ہیں۔ جو انہیں اُن کی خدمات کے لئے زندہ رکھے۔

مارکس نے "کتاب سرمایہ" میں "نظریۂ قدر زائد" Surplus Value Theory کی روشنی میں سرمایہ داری کے ظلم کی جو حقیقت واضح کی ہے، وہ بجائے خود ایک حقیقت ہی ہے، اگرچہ اس کی تعبیر میں مارکس کی نگاہ بھٹک گئی۔ وہ "مصنوعات" (Commodities) کی ساری قدر (value) کو محنت (Labour) کا نتیجہ شمار کرتا ہے۔ حالانکہ در اصل سرمایہ و محنت دونوں کے باہمی تعاون سے مصنوعات اور ان کی قدر نمودار ہوتی ہے اور یہ دونوں منافع کے والدین ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک

تنہا نہ مصنوعات کو وجود دے سکتا ہے، نہ قدر کو، نہ منافع کو۔ ظلم جو کچھ ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ سرمایہ اپنے غلبہ کی وجہ سے محنت کا حق مار لے جاتا ہے۔ اور اسے "شریکِ کار" کی حیثیت دینے پر تیار نہیں ہوتا۔ اس ظلم کو مارکس نے واضح کرنے کے لئے مبالغہ آمیز طریقِ استدلال استعمال کیا ہے۔

مزدوروں کی اہم مشکلات مارکس کے فلسفہ میں زیادتی موجود ہے، یا نہیں، نظامِ سرمایہ داری میں مزدور پہ بہر حال زیادتی ہو رہی ہے، اور اس زیادتی کے چند نمونے یہ ہیں:-

۱- مزدوروں کے معاوضے بالعموم ان کی ناگزیر ضروریات پورا کرنے سے بھی کم رہتے ہیں۔

۲- ان کو اپنی طبعی قوتِ کارکردگی سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔

۳- بعض کام مزدوروں کی صحت کو مستقلاً تباہ کرتے ہیں، اور کبھی ان کے بعض اعضا ضائع ہو جاتے ہیں۔

۴- ان کو رہنے کیلئے تنگ اور مضرِ صحت مکانات فراہم کئے جاتے ہیں۔

۵- اُن کو بیماری میں علاج کی سہولتیں بہم نہیں پہنچتیں۔

۶۔ ان کے بچے تعلیم و تربیت سے محروم رہتے ہیں۔

حکومت پر چونکہ سرمایہ داروں کا قبضہ ہوتا ہے، اس لئے قانون اور اجتماعی ماحول دونوں ان حالات کو قائم رکھ کر ان کا پہرہ دیتے رہتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کے مزدوروں کو مجبور کر دیا گیا ہے کہ وہ نظم کی قوت سے سرمائے کے خلاف خونی جنگ لڑیں اور اپنے حقوق وصول کریں۔ لیکن اسلامی شریعت میں حکومت چونکہ سرمایہ و محنت میں تعاون اور توازن پیدا کرنے کی ضامن ہے اور محنت کے حقوق اصولی حیثیت سے مقرر ہیں۔ اس لئے نظامِ اسلامی طبقاتی تصادم سے پاک رہتا ہے

ہمارے پاکستان میں مزدور کی آج جو حق ماریاں ہو رہی ہیں، ان کو اسلام جاری رہنے نہیں دے سکتا، کیونکہ یہ مزدور کی حق ماریاں نہیں، خود اسلام کی حق ماریاں ہیں!

محنت کش جانوروں کے حقوق | مزدوروں کو جو لوگ آج جانوروں کی طرح استعمال کر رہے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ شارع علیہ السّلام نے جانوروں کے لئے بھی جو حقوق مقرر کئے ہیں، وہ بھی ان حقوق سے زائد ہیں، جنہیں نظامِ سرمایہ داری نے انسانوں کو عطا کیا ہے۔ جانوروں

کی خدمات سے استفادہ کرنے والوں سے نبی صلعم نے یہ چاہا ہے کہ :-

۱- چاہیئے کہ جانور سواری کرتے وقت ترو تازہ ہوں اور کام لینے کے بعد ترو تازہ حالت ہی میں ان کو کھول دیا جائے۔

۲- ان کے چارے، پانی اور جگہ کا مناسب انتظام کیا جائے۔

۳- ان کو لعنت نہ کی جائے اور بے جا نہ مارا جائے۔

صرف اول الذکر ہدایت ہی کو اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو اس میں بہت سی باتیں شامل ہیں۔ جانور ترو تازہ جبھی ہو سکتا ہے کہ اس کے بدن کی ضروریات پوری کی گئی ہوں اور اس پر اس کی قوت سے زائد بار نہ ڈالا گیا ہو، پھر ترو تازہ حالت میں چھوڑ دینے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اعتدال سے خدمت لی جائے۔

پھر نبی صلعم نے ایک عورت کو محض اس بنا پر دوزخ کا مستحق بنایا کہ اُس نے ایک بلی کو باندھ تو رکھا تھا لیکن اسے کھانے پانی سے محروم رکھا۔ سوال یہ ہے کہ وہ لوگ جو انسانوں کی زندگیاں سرمائے کے کھونٹے سے باندھ رکھتے ہیں اور پھر ان کو اور ان کے بچوں کو نیم فاقہ کی حالت میں مبتلا رکھتے ہیں، اُن کا ٹھکانا کہاں ہوگا؟ جس

خدا کو اپنی پیدا کی ہوئی ایک بلّی کا بھوکوں رکھنا سخت نامرغوب ہے، اس کے ہاں اپنے پیدا کئے ہوئے انسانوں کی فاقہ مستیوں پر کتنا مواخذہ ہوگا، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جس نبی نے جانوروں پر اُنکی قوت سے زیادہ بار ڈالنے کو ممنوع ٹھہرایا ہے اور ان کو تروتازہ رکھنے کا حکم دیا ہے، اس کی شریعت میں انسانوں کی قوت وصحت کا کیا کوئی لحاظ نہ ہوگا؟ ——— یقیناً ہے!

احادیث کی رہنمائی | چنانچہ غلاموں اور خادموں کے حقوق کی جو تفصیلات احادیث میں مذکور ہیں، اُن سے آج مزدوروں کے حقوق کو متعیّن کیا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

۱۔ عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم للملوك طعامہ وکسوتہ ولا یکلف من العمل مالا یطیق۔	ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ غلام (خادم) کے لئے خوراک اور لباس چاہئے۔ اور اس پر ایسے کام کا بار نہ ڈالا جائے جس کی وہ قوت نہ رکھتا ہو

۲۔ معرور بن سویدؓ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوذرؓ سے

ان کی ملاقات اس حال میں ہوئی کہ وہ اور ان کا خادم دونوں ایک سی برد یمانی (قیمتی قسم کی چادریں، اوڑھے ہوئے تھے۔ معرور بن سویدؓ نے اس صورتِ واقعہ کو دیکھ کر حضرت ابو ذرؓ سے خادموں کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے جواب میں نبی صلعم کا یہ ارشاد نقل کر دیا کہ:-

هم اخوانکم وخولکم	یہ لوگ تمہارے بھائی اور خادم ہیں
جعلهم الله تحت ایدیکم	انہیں اللہ نے تمہارے زیرنگین کیا ہے
فمن کان اخوه تحت یده	پس جس شخص کے زیرنگین اس کے کسی
فلیطعمه مما یاکل ولیلبسه	بھائی کو کیا گیا ہو، اسے چاہئے کہ وہ جیسا
مما یلبس ولا تکلفوهم من	کچھ خود کھاتا ہے، اسے کھلائے، جیسا
العمل ما یغلبهم فان	خود پہنتا ہے اسے پہنائے اور ان
کلفتموهم فاعینوهم	پر زیادہ محنت کا کام نہ ڈالو، اگر مجبوراً
علیه (الخمسة الا النسائی)	ڈالو تو پھر ساتھ ہو کر خود ان کی مدد بھی کرو۔

اس میں شک نہیں کہ یہ احکام غلاموں کے بارے میں خصوصیت سے تھے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آج کے مزدور "اخوانکم" کی تعریف میں نہیں آتے؟ کیا "جعلهم الله تحت ایدیکم" کی صفت ان میں

بھی نہیں ہے؛ کیا ان پر ان کی قوت سے زیادہ بھاری کاموں کا بار ڈالنا چاہئے؟ — اگر نہیں تو پھر طعام اور لباس کے بارے میں بھی اصول یہی ہو سکتا ہے کہ ان کو بھی اپنی طرح اوسط درجے کی صالح غذا اور صاف ستھرا لباس فراہم کرنا ضروری ہے — اور ان کے معاوضے ایسے ہونے چاہئیں کہ ان کے بل پہ بھلی زندگی گذار سکیں۔

۳۔ بخاری، ابوداؤد اور ترمذی کی روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا:۔

اذا احدکم خادمہ	اگر تم میں سے کسی کا خادم اس کے
بطعامہ فان لم یجلسہ معہ	لئے کھانا تیار کر کے لائے اور وہ خادم
فلیناولہ لقمۃً او لقمتین	کو اپنے ساتھ کھانے کے لئے نہ بٹھائے
او اکلۃ او اکلتین فانہ ولی	تو کم سے کم، ایک دو لقمے تو اسے
حرّہٗ وعلاجہٗ	کھلا دے — کیونکہ اس نے گرمی اور
	پکانے کی تکلیف گوارا کی ہے۔

یعنی خادم یا ملازم نے جو کھانا آقا کے لئے پکایا ہو۔ اس میں سے اسے بھی حصہ ملنا چاہئے — (معاملہ کے دوسرے پہلو چاہے کچھ

ہوں)، ورنہ بالعموم خدام خیانت کا دروازہ کھول لیتے ہیں۔ اس
حدیث سے ایک اشارۂ بعیدیہ ملتا ہے کہ کسی کارندے سے اگر
ضروریاتِ زندگی میں سے کسی کی تیاری کا کام لیا جا رہا ہو تو خود اس
کارندے کی وہ ضرورت اٹکی نہ رہنی چاہیئے بلکہ اپنی محنت سے تیار کردہ
مصنوعات میں سے اسے بطورِ عطیہ و ہدیہ کے کچھ نہ کچھ حصّہ ملنا
چاہیئے۔ یہ حدیث جس اخلاقی رجحان کو اُبھارنا چاہتی ہے، اس کی
اہمیت سرمایہ دارانہ نظام میں بھی کچھ نہ کچھ ملحوظ رکھی جاتی ہے
مثلاً مدرسین کے بچّوں سے تعلیم کی فیس نہیں لی جاتی، یا ریلوے
ملازمین کو سفر کی سہولتیں دی جاتی ہیں، اسی طرح بعض صنعتی کارخانوں
میں مزدوروں کو اُن کی مصنوعات ارزاں نرخوں پر دی جاتی ہیں، وغیرہ
یہ بہر حال ظلم ہے کہ ایک مزدور دنیا جہان کے لوگوں کے لئے
کپڑا بُنتا رہے اور خود اس کا تن نہ ڈھکے، ایک کارخانے کے کارکن
کروڑوں ابنائے نوع کے لئے کونین کی ٹکیاں بناتے رہیں، لیکن خود
اُن کے بچّوں کو ملیریا سے بچنے کے لئے کونین نہ ملے۔ اخلاقاً چاہیئے
یہی کہ ہر کارخانے کے مزدوروں کو اُن کی مصنوعات میں سے کچھ

حصّہ بطور ہدیہ ملے یا کم سے کم ارزاں نرخوں پر حاصل ہو۔ یہ مسلکِ احسان اجیر اور مستاجر کے درمیان قرب اور محبّت کو بڑھانے والا ہے اور اسی وجہ سے اسلام کی نگاہ میں پسندیدہ ہے۔

۴۔ نبی صلعم نے یہ چاہا ہے کہ غلاموں اور خادموں کو ایک ایک دن میں ان کے ستّر ستّر قصوروں پر معافی دی جائے۔

۵۔ ابوداؤد و نسائی کی روایت ہے کہ:۔

امر رسول اللہ صلعم	ایک دن نبی صلعم نے صدقے کی
یوماً بالصدقة فقال رجل	نصیحت کی۔ ایک شخص نے عرض کیا
یا رسول اللہ عندی دینار	یا رسول اللہ! میرے پاس ایک دینار
قال تصدق به علی نفسك قال	ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اپنی جان پر
عندی آخر قالَ تصدَّق به	صدقہ کر۔ اس نے پھر کہا کہ ایک اور
علی ولدك قال عندی آخر	بھی ہے آپ نے فرمایا اپنی بیوی پر
قال تصدق به علی زوجك	صرف کر۔ اس نے کہا میرے پاس اور
قال یا رسول اللہ عندی	دینار بھی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اپنے
آخر قال تصدق به علی	خادم پر صرف کر، اس نے پھر عرض کیا

خادمٌ قال عندی اٰخر — یا رسول اللہ میں ایک اور بھی رکھتا ہوں۔ قال انت ابصر بہٖ۔ — آپ نے فرمایا کہ اس کے بارے میں تو خود ہی فیصلہ کر لے!

اس روایت کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی کو اپنی ذات اور اہل و عیال کے بعد اپنے خادموں، ملازموں اور مزدوروں کے حقوق پورے کرنے چاہئیں اور اس کے صدقات کے لئے یہی لوگ سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کارخانہ داروں کے کاروباری اور گھریلو اموال کی زکوٰۃ اور ان کے دوسرے صدقات خود ان کے مزدوروں پر صرف ہونے چاہئیں۔

۶۔ حضرت عمرؓ کے اسوہ میں بھی ایک خاص رہنمائی مزدوروں کے بارے میں ملتی ہے۔ آپ نے ایک بوڑھے ذمّی کو گداگری کرتے دیکھا تو آپ کو رنج ہؤا اور آپنے فرمایا کہ یہ ہمارے لئے صحیح نہیں ہے۔ کہ ایک شخص کی جوانی کے زمانے میں تو ہم (ذمہ ٹیکس کی صورت میں) اس سے فائدہ اٹھائیں، لیکن معذوری کی حالت میں اسے ذلّت و خواری میں چھوڑ دیں۔ چنانچہ آپ نے بیت المال سے اس کا وظیفہ

مقرر کر دیا۔

یہاں سے یہ اخلاقی اصول ملتا ہے کہ جس شخص کی جوانی اور صحت کی حالت میں کوئی اس سے فائدہ اٹھا رہا ہو، اس پر اگر بڑھاپے یا معذوری یا بیماری کی حالت طاری ہو جائے تو استفادہ کرنے والے کا فرض ہے کہ وہ اس کی کفالت کرے

کم سے کم حقوق | شارع کی ان ہدایات کو اگر ملحوظ رکھ کر اصول طے کئے جائیں تو حقوقِ محنت یہ قرار پاتے ہیں۔

ا۔ ایسا معاوضہ دیا جانا چاہیئے جو محض ان کے جسم و رُوح کا رشتہ ہی برقرار نہ رکھے، بلکہ ان کی صحت اور ترو تازگی کو بھی بحال کرے۔

ب۔ رہن سہن کے ایسے انتظامات مزدوُروں کو فراہم کرنے چاہئیں جو ان کے کنبے کی صحّت کے لئے تباہ کن نہ ہوں۔

ج۔ بیماری میں ان کے معالجہ کا انتظام ہونا چاہیئے — ورنہ ترو تازگی کیسے رہے گی۔

د۔ ان سے ایسا اور اتنا کام نہ لینا چاہیئے جس سے ان کی صحت گرے اور ان کی قوتِ کارکردگی ضائع ہو۔

ہ۔ اُن کی کوتاہیوں پر سختی کرنے کے بجائے نرم برادرانہ سلوک کرنا چاہیئے۔

س۔ جو مصنوعات اُن کی محنت سے تیار ہوں ان میں سے کوئی حصّہ ان کو ہدیہ کیا جائے یا ارزاں دیا جائے۔

ص۔ کارخانہ داروں کے صدقات کو صرف مزدوروں کی تعلیم۔ ان کے معالجے، ان کی ناگہانی ضروریات، ان کے بچّوں کی تربیت وغیرہ پر صرف ہونا چاہیئے۔ نیز قربانی، صدقۂ فطر اور کفارہ ہائے معصیت کے قریبی مستحق بھی یہی لوگ ہیں۔

ط۔ بیماری میں مزدوروں کو الاؤنس اور بڑھاپے اور ناکارگی کی حالت میں پنشنیں ملنی چاہیئیں۔

ان اصولوں کی روشنی میں آج اسلامی حکومت کو اہلِ سرمایہ اور اہلِ محنت کو یکجا بٹھا کر منصفانہ طریق سے حقوقِ محنت کو طے کرنا ہوگا۔ اور ان کے تحفّظ کے لئے ایک ضابطہ مرتب کرنا ہوگا۔ تاکہ اگر کسی کی حق ماری کی جائے تو وہ اپنا حق حکومت کی مدد سے بھی وصول کر سکے۔

بڑے کارخانوں میں جہاں (مثلاً، ۲۰ سے زیادہ کارکن کام کرتے ہوں) حکومت یہ لازم ٹھہرا سکتی ہے کہ وہاں سرکاری نقشے کے مطابق مکانات بنا کر مزدوروں کی بستی بسائی جائے، وہاں سرکاری اسکیم اور معیار کے مطابق ایک مدرسہ اور ایک ہسپتال قائم کیا جائے۔ اور ان کا انتظام اگرچہ حکومت کے ہاتھوں میں ہو، لیکن اِن کے سالانہ مصارف کارخانہ سے وصول کئے جائیں۔ چھوٹے کارخانوں اور عام ملازموں اور خانگی خادموں کے کنبوں کے معالجے اور تعلیم کے مصارف کا بِل اُن سے کام لینے والوں کے ذمّے ڈالا جائے۔ اِلّا یہ کہ وہ استطاعت نہ رکھتے ہوں اور حکومت ان کی جگہ بیت المال سے روپیہ صرف کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر مزدوروں کی سوسائٹی اسلامی عبادات و اخلاق کے ذریعے منظم کی جائے اور اجیروں اور متاجروں میں اگر اسلامی اخوّت کے روابط اُستوار کئے جائیں تو موجودہ ناہمواریوں کا اور طبقاتی تصادم کا نام و نشان مٹ جائے۔

ایسے کارخانہ دار جو حکومت کی رہنمائی کے مطابق اسلامی اصولوں پر ادائے حقوق کرنے میں مزدوروں سے مسلسل خیانت

کریں، ان کے کارخانوں کو ایک مقررہ مدّت کے لئے حکومت کی تحویل میں رکھنے کا ضابطہ موجود ہونا چاہئے، جس کے تحت ان کو اسلامی اخلاق اور احترام حقوق اور ذمہ دارانہ پن کی تربیّت دی جا سکے۔

مزدوروں کے لئے بیت المال کی پشت پناہی

اسلامی حکومت کے تحت مزدوروں کو اپنی محنت ارزاں نرخوں اور گھٹیا شرائط پر بیچنے سے بچانے کا بہترین ذریعہ بیت المال کی پشت پناہی ہے۔ بیت المال زکوٰۃ اور صدقات اور فئے اور غنیمت کی بے حساب رقوم لئے جب اہلِ محنت کی مدد کو موجود ہو کہ اگر وُہ بے روزگار یا معذور ہوں گے تو ان کی اپنی حکومت ہمہ تن ان کی کفالت کے لئے موجود ہے تو "محنت" کا نرخ بہرحال بڑھ جائے گا اور ان کو جانوروں کی سطح پر گر کر سرمایہ داروں سے معاملہ کرنے کی مجبوری سے نجات مل جائے گی۔ اِس صورت میں وہ ہڑتالوں اور احتجاج کے مظاہرات کو زیادہ طویل اور وزنی بنا سکیں گے۔ اور سرمائے کی قوّت کا زیادہ مضبوطی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں گے۔ اگرچہ اس کی ضرورت ایک تربیت یافتہ صالح سوسائٹی میں پیش نہیں آسکتی۔ حکومت ایسے انتظامات بھی کر سکتی ہے کہ وُہ ہر کارخانے

کے کارکنوں کے مشاورتی بورڈ مرتب کرا دے اور پھر اُن بورڈوں کا ایک مرکزی ادارہ موجود ہو جس میں ہر صنعت کے مخصوص مسائل اور اس کے مزدوروں کی ضروریات کے بارے میں اصلاح و ترقی کی مختلف اسکیمیں مرتّب ہوں اور سرمایہ و محنت کے تعاون کو نشوونما دینے کے لئے پروگرام بنیں اور وہ اسلامی حکومت کی مجلسِ شوریٰ کے سامنے سفارشات کی صورت میں پیش ہوں۔ اس طرح محنت کی حق ماریوں کا بآسانی خاتمہ کیا جاسکتا ہے۔

اِن ساری تدابیر میں یہ احتیاط ضروری ہے کہ اہلِ سرمایہ اور اہلِ محنت کے درمیان کسی طرح کی طبقاتی تقسیم کا وجود نہ تو تسلیم کیا جائے اور نہ اسے فروغ پانے میں مدد بہم پہنچ سکے۔ اُمّت کی وحدت کو اصولاً ایک حقیقت قرار دے کر اسی کو فروغ دینا پیشِ نظر ہو۔ ورنہ اصلاح کے بجائے اُلٹا بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے۔

۵۔ اِسرافیات کا سدِّباب

اسلام وہ دین ہے جس میں وضو اور غُسل کے لئے ضرورت سے

زیادہ پانی بہا دینا بھی عنداللہ قابلِ مواخذہ جرم ہے، کجا کہ عیش وعشرت کے ہنگاموں اور لہو ولعب میں اللہ کے خزانہ ہائے رزق کو جھونکا جائے۔ پھر یہ وہ دین ہے جس نے مُسرفین کو شیطان کی برادری میں شامل کیا ہے۔ پس اگر پاکستان میں اسلامی نظام نافذالعمل ہوگا تو اسراف کا سدِّباب کرنے کے لئے اسے لازماً مختلف قانونی اور اخلاقی تدابیر اختیار کرنی پڑیں گی۔ سوسائٹی میں اسراف کے حسبِ ذیل اثرات نمایاں ہیں:۔

۱۔ دولت عامہ کا ایک کثیر حصّہ امیر لوگ اور ان کی دیکھا دیکھی متوسط طبقے کے لوگ ضروریاتِ زندگی سے بالاتر لایعنیات میں کھپا دیتے ہیں۔ نتیجتہً سوسائٹی کے عوام کی محرومی بڑھ جاتی ہے۔

۲۔ مُسرفانہ معیارِ زندگی کے مصارف پورے کرنے کے لئے عوام کی جیبوں سے روپیہ نکالنے کی غیر اسلامی صورتیں اختیار کی جاتی ہیں، جن کی وجہ سے پورا معاشرہ بگڑ جاتا ہے اور لازماً ناہمواریاں بڑھتی ہیں۔

۳۔ سوسائٹی کے بے شمار مردعورتیں عوامی ضروریات کو

پورا کرنے کے لئے اعلیٰ اور پاکیزہ خدمات انجام دینے کے بجائے رقص وسرود اور امرا کی تفریح کے دوسرے لوازم کے اہتمام میں کھپ جاتے ہیں اور "پیدا آور" صنعتوں اور علم و اخلاق کی ترقی کی رفتار کمزور ہو جاتی ہے۔

۴۔ اسراف کی چھوت امرا سے متوسط طبقے میں اور متوسط طبقے سے غریب عوام میں پھیلتی ہے اور اس طرح ایک عام اخلاقی انحطاط اس کے ساتھ ساتھ پھیلتا جاتا ہے۔

منصوص ممنوعات | اسلامی شریعت نے اسرافیات کی روک تھام کے لئے جن چیزوں پر صریح قانونی بندشیں لگا دی ہیں وہ یہ ہیں:-

ایک یہ کہ شراب اور دوسری نشہ آور چیزوں کے استعمال کو جرمِ قابلِ مواخذہ ٹھیرایا ہے،

دوسرے یہ کہ سونے کے زیورات اور ریشم کے ملبوسات کو مردوں کے لئے قطعی حرام کر دیا ہے،

تیسرے یہ کہ چاندی سونے کے برتنوں اور (عورتوں کے زیورات کے سوا) دوسرے آرائشی سامانوں کو ممنوع قرار دیا ہے،

چوتھے یہ کہ حرمتِ تصاویر کی وجہ سے آرٹ گیلریاں بنانے اور

ڈرائنگ روم کو مجسّموں سے آراستہ کرنے کا دروازہ بند کر دیا ہے۔
پانچویں یہ کہ پیشہ ور گویّوں اور آلاتِ موسیقی کے وجود کو مسلم سوسائٹی کے لئے ناقابلِ برداشت قرار دیا ہے۔
چھٹے یہ کہ رقص اور بے حیائی کی دوسری صورتوں، نیز ورزشی اور عقلی قسم کے تفریح آمیز کھیلوں کو مستثنیٰ کر کے، لہو و لعب اور تضیعِ اوقات کو جائز نہیں رکھا۔
ساتویں یہ کہ قمار آمیز تفریحات کو حرام ٹھہرایا ہے۔
آٹھویں یہ کہ زندگی کی تقریبات میں ضیاعِ مال کو روکنے کے لئے ان کو سادگی کی حدود کا پابند کر دیا ہے۔
نویں یہ کہ بلا شدید ضرورت کے کُتّے پالنے کی اجازت نہیں دی۔
دسویں یہ کہ مکانوں کو نقش و نگار سے مزیّن کرنے اور قبروں کو چُونے گچ بنوانے کو سخت مکروہ قرار دیا ہے۔
گیارھویں یہ کہ لباس میں کبر کے، اور عام معاشرت میں، ٹھاٹ کے مظاہرے کو بھی حرام کر دیا ہے۔
یہ ہیں سے طے شدہ امور ہیں کہ اسلامی نظام میں شارع کی ہدایات

کے تحت قانونی طور پر محکمۂ احتساب امرا اور عوام کو ان سارے مفاسد سے روک دیگا، اور ظاہر ہے کہ یہ اجتماعی دولت کو محفوظ کرنے اور معاشی ناہمواریوں کو دُور کرنے اور امراء و عوام میں اخوت و مساوات پیدا کرنے کی بہترین صورت ہے۔ ان مفاسد سے معاشرے کو پاک کر دینے کے بعد معیارِ زندگی ایسا سادہ ہو جاتا ہے کہ پھر ہمارے ہاں کی محنت کی اُجرتیں اور اشیا کی قیمتیں اور روپے کی قوتِ خرید بین الاقوامی مارکیٹ میں بڑی بڑی قوموں کی معاشی برتری کو شکست دے سکتی ہے۔

اجتہادی بندشیں | منصوص "اسرافیات" کی مختلف شکلوں کو اور ان کے متعلق شریعت کے نواہی کی حکمتوں کو ملحوظ رکھ کر ایک اسلامی حکومت کی پارلیمنٹ یہ طے کر سکتی ہے کہ اسراف کے دوسرے مظاہر کون سے ہیں جن کی حرمت کے لئے اگر کوئی منصوص دلیل نہ ہو تو کم از کم وہ مشتبہات ضرور ہیں —— اور ان کی بندش کا اہتمام کر سکتی ہے۔ علاوہ بریں عام اوسط درجے کی زندگی کی ضروریات کو مستثنیٰ کر کے آرائش، زیبائش، جائز تفریحات، اور خوشحالی اور

آرام پسندی کے لوازم پر بڑھتے ہوئے ٹیکس لگا کر ان کے فروغ کو روکنے کی تدبیر بھی کوشش کی جائے۔ اس سے بہ یک وقت دو فائدے ہوں گے، ایک یہ کہ لوگ ضروریات تک مصارف کو محدود رکھنے پر مائل ہونگے، دوسرے یہ کہ عوام ملک کی اجتماعی ضروریات کیلئے فنڈز بہم پہنچ سکیں گے۔

بطورِ مثال یہ کہا جا سکتا ہے کہ غربا اور اوسط درجے کے گھرانوں کی ضروریات سے گراں قسم کے پارچات، برتن، فرنیچر، فرش، قالین، ریفریجریٹر، موٹر کاریں، کیمرے، ریڈیو سیٹ وغیرہ خریدنے والوں کو ملک کی اجتماعی ضروریات کے لئے مرکزی فنڈ میں ٹیکس داخل کرنا چاہیئے۔ اسی طرح ریلوں میں فسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے والوں کے کرایوں کے ساتھ ایسا ٹیکس ضرور شامل ہونا چاہیئے جو تیسرے درجے کے مسافروں کی سہولیات کے لئے صرف ہو، اسی طرح جو لوگ دو منزلہ، سہ منزلہ اور طویل و عریض مکانات تعمیر کرنا چاہیں، وہ جہاں اپنے آرام کے لئے بہت سا روپیہ صرف کرنے کی استطاعت کا مظاہرہ کرتے ہیں، وہاں اُن سے غُربا کی ضروریات کے لئے بھی مناسب حصہ وصول کیا جا سکتا ہے۔

علیٰ ہٰذا القیاس اعلیٰ معیار کی زندگی بسر کرنے والوں پر اجتماعی ضروریات کا بار اس طرح بخوبی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اسرافیات کے کاروباری اڈے | موجودہ سوسائٹی میں اسرافیات اور تعیّشات کے دلدادگان کے لئے باقاعدہ کاروبار ہوتے ہیں اور اڈّے قائم کئے جاتے ہیں۔ مثلاً پاکستان میں بے شمار مراکز بدکاری قانون کی سرپرستی میں قائم ہیں۔ کتنے ہی شراب خانے کھلے ہیں۔ لاکھوں ہی سینما چل رہے ہیں، کئی رقص گاہیں ہیں، بہت سے قمار خانے ہیں اور ان کے ذریعے اسراف اور عیاشی کی باقاعدہ تبلیغ ہوتی ہے۔ علاوہ بریں حکومت کے ریڈیو اسٹیشن بھی لوگوں کی تعیّش پسندیوں کو غذا فراہم کرتے ہیں۔ اور لٹریچر بھی آرٹ کے خوشنما نام پر لہو و لعب کے اخلاق سوز اسباب کو فروغ دیتا ہے۔ اور مصوّری و بت تراشی رہی سہی کسر پوری کر دیتی ہے۔

ان اڈّوں کو جن کے ذریعے سرمایہ دار لوگ عوام کا اخلاق بگاڑ کر روپیہ کماتے ہیں، بند کئے بغیر معاشی ناہمواریوں کا سدّباب کرنا ممکن نہیں ہے۔ رہا ریڈیو لٹریچر اور سینما کا معاملہ، سو ان ذرائع تعلیم

و تربیت کو عوام کی ذہنی، اخلاقی، معاشرتی، زرعی، صنعتی اور سیاسی ترقی کے لئے استعمال ہونا چاہئے، نہ کہ معاشقے اور بے حیائی کے ہنر سکھانے کے لئے! یہ بجا کہ ریڈیو اور سینما میں جائز قسم کی تفریحات رکھی جا سکتی ہیں۔ مگر لغویات کے لئے بہر حال ان بہترین ذرائع کو وقف رہنے دینا کسی اسلامی حکومت کے لئے جائز نہیں ہے۔

۷۔ اسلامی قانونِ وراثت کا نفاذ

نظامِ سرمایہ داری کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک شخص کی جمع شدہ دولت اور جائداد کو حتی الوسع یکجا رکھا جاتا ہے اور مرتکز شدہ سرمائے کو جوں کا توں اولادِ اکبر کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اسلام اس کے عین بالمقابل ایک فرد کی زندگی بھر کے اندوختے کو اس کی وفات پر کئی ٹکڑوں میں بانٹ دیتا ہے۔ بنا بریں اسلامی قانونِ وراثت کے حسب ذیل خواص کو ذہن نشین کئے بغیر اس کے معاشی عمل کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

اسلامی قانونِ وراثت کے خواص | ۱۔ اس قانون کے تحت ۸ ایسے

مستقل ورثا ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو لازماً متوفی کے ترکے میں سے حصّہ ملتا ہے۔

(۲) اِس قانونِ وراثت کے تحت ذکور کے ساتھ اناث بھی شریکِ ترکہ ہوتی ہیں، لہٰذا اس کے ذریعے دولت کا پھیلاؤ بہت زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔

(۳) یہ قانون دوسرے اعزّہ کے ساتھ خاوند کے ترکے میں سے بیوی کو ـــــــ اور ـــــــ بیوی کے ترکے میں سے خاوند کو اہم حصّہ دلواتا ہے اور یہ قاعدہ ایک برادری کے اموال کو دوسری برادری میں منتقل کر کے پھیلاؤ کی رفتار تیز تر کر دیتا ہے۔

(۴) یہ قانون ذوی الفرائض (اوّل درجے کے ۸ ورثاء) کے ساتھ عصبات (دوسرے درجے کے ورثاء) اور ذوی الارحام (تیسرے درجے کے ورثا) کو بھی ترکے کا حقدار قرار دیتا ہے، اِلّا یہ کہ از روئے قانون الاقدم فالاقدم کے اصول پر بعض کو حصّہ نہ پہنچتا ہو۔

(۵) اس قانون کی رُو سے ہر شخص اپنے ترکہ کے ایک تہائی حصّے کے بارے میں دو طرح کی وصیّتیں کر سکتا ہے، بلکہ اسے ترغیب

دی گئی ہے کہ وہ کرے اور بعض علما کے نزدیک ایسا کرنا واجب ہے۔
(۱) اسٹیٹ، عوامی ضروریات، رفاہِ عامہ اور تحریک اقامت دین کے لئے وقف کرنا (ب) قانونی طور پر ترکہ نہ پانے والے اعزہ یا محسن دوستوں یا پڑوسیوں اور خادموں کو حصّہ دلانا۔

(۶) اس قانون کی رُو سے لاوارث لوگوں کے ترکے بیت المال میں داخل ہو کر مفادِ عامہ کے لئے مخصوص ہو جاتے ہیں۔

اِن اشارات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی قانون وراثت بڑے وسیع معاشی اثرات رکھتا ہے اور یہ جہاں نافذ ہو، وہاں دولت چند تجوریوں میں مقید نہیں رہ سکتی اور نہ چند کارخانہ داروں اور زمینداروں کی معاشی اجارہ داری قائم رہ سکتی ہے۔

کمیونسٹ حضرات عموماً اسلامی قانونِ وراثت کی اہمیّت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کیونکہ اگر اسلام کے ذرائع سے معاشی مسئلہ حل ہونے لگے تو ان کا کیا کام باقی رہ جائے گا۔ کاش کہ وہ دیانت داری سے اس قانون کے معاشی عمل کا اسی طرح تحقیقی مطالعہ کریں، جس طرح وہ "نظریۂ قدرِ زائد" (Surplus Value Theory)

کو سمجھنے کے لئے دماغ کھپاتے ہیں۔ ان حضرات کی خدمت میں درخواست ہے کہ آپ براہِ کرم ایک کاغذ پنسل لیجئے اور پاکستان کے حالات پر اس قانون کو منطبق (Apply) کر کے دیکھئے کہ اس کے اثرات کیا ہوں گے۔

اسلامی قانونِ وراثت کا معاشی عمل

آج ہم ۶ کروڑ افراد میں سے خوشحال لوگوں کی تعداد ۲ کروڑ کے لگ بھگ ہے اور بقیہ ۴ کروڑ مفلس، فاقہ کش، مفلوک الحال، گداگر اور ضروریاتِ زندگی سے محروم ہیں۔ آپ ایک حساب داں کی طرح اعداد و شمار کو مرتب کر کے نتیجہ نکالئے کہ اگر شرح اموات ۲ فی ہزار اور متوفیان کے اوسط ورثاء اسلامی قانون کے مطابق ۴ قرار پائیں (حالانکہ عملاً یہ تعداد ۵ سے لے کر ۱۰، ۱۵، ۲۰ اور ۴۰ بلکہ اوپر تک جا سکتی ہے) تو دو کروڑ افراد کی خوشحالی کتنی مدّت میں ۶ کروڑ افراد میں منتقل ہو سکتی ہے؟

یہ اعداد و شمار کا ایک صاف اور سیدھا سا حساب حیرت انگیز نتائج تک لے جاتا ہے یعنی کل ۲۰ سال کی مدّت میں ہماری پوری

قومی دولت ۶ کروڑ افراد میں پھیل جاتی ہے اور غیر معمولی قسم کی ہر اونچ نیچ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ بھی اس صورت میں جب کہ اسلامی نظام میں صرف "قانونِ وراثت" ہی واحد ذریعہ ہو انتشارِ دولت کا، لیکن اگر زکوٰۃ اور دوسرے ذرائع بھی کام کریں تو پھر زیادہ سے زیادہ مدت جو مساواتِ عامہ پیدا کرنے کے لئے درکار ہے وہ دس سال سے زائد نہ ہو گی۔

یہ دس سالہ خاموش اور پُرامن اور غیر خونی انقلاب اگر اسلامی قانونِ وراثت اور اس کے دوسرے ذرائع اصلاح کے بل پر اس سے بہتر نتائج دکھا دے جتنے کہ روس میں اشتراکیت کے طبقاتی تصادم کے خونی ہنگامے اور قتل و غارت کے طوفان نے دکھائے ہیں تو آخر اسلام کے ہوتے ہوئے کمیونزم کی طرف توجہ کرنے والوں سے زیادہ رجعت پسند اور غیر معقول (Unrationalist) اور کون ہو گا؟ یہاں نہ شخصی آزادی سلب کی جائیگی، نہ سی، آئی، ڈی کا جال بچھایا جائے گا، نہ فوجی عدالتوں کا دور دورہ ہو گا۔ نہ محنت گھروں Concentration camps میں ہزاروں آدمیوں کو محبوس کرنا پڑے گا۔

نہ سرحدیں بند کی جائیں گی، نہ جھوٹا پروپیگنڈہ کرنے کی ضرورت ہو گی، اور کام اس سے بہتر ہو گا جتنا کہ اشتراکیت نے ۳۰ سال کے مصارف اور تشدّد کے بعد کر کے دکھایا ہے۔ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ اسلام نے اپنے معاشی انقلاب کی اسکیم کو اپنے پورے نظام میں اس طرح جذب کر دیا ہے کہ جہاں یہ نظام چلا، بغیر اس کے کہ آپ سرمایہ دار اور کارخانہ دار کے خلاف طبقاتی جنگ کا بگل بجا کے میدان میں آئیں، از خود سرمایہ داری کی جڑیں کٹنے لگتی ہیں۔

آپ غور کیجئے کہ آج ہم میں سے جو ۲۰، ۲۵ ہزار افراد بڑی بڑی زمینوں اور کارخانوں اور تجارتوں کے مالک ہیں، ان سے جب اسلامی نظام یہ مطالبہ کرے گا — کہ اپنی موجودہ املاک کا جو جو حصّہ انہوں نے اپنے کسی مورث سے حاصل کیا ہے، اس میں سے اپنا شرعی حصّہ رکھ کر بقیہ کو دوسرے حصّہ داروں کے حوالے کر دیں تو آناً فاناً یہ بڑے بڑے املاک ۴، ۶، ۱۰، ۲۰ ٹکڑوں میں بٹ جائیں گے اور کئی کاروبار انفرادی ملکیّت سے نکل کر ایک دم لمیٹڈ فرموں اور کمپنیوں کی شکل میں بدل جائیں گے! اسلامی قانون

وراثت کا ایک ہی وار غریبوں میں سے ۲، ½۲ لاکھ افراد کو اُوپر اُٹھا کر انہیں ایسے املاک کا مالک بنا دے گا جن کے بارے میں کل وہ خواب بھی نہ دیکھ سکتے تھے — اور اسی طرح ہر سال اور ہر روز اس قانون کے اعجوبے اپنا کام کرتے رہیں گے۔

یہ مخصوص ملکیتوں کو عوامی ملکیتوں میں بدلنے کا بہت ہی معقول، اور تیز رفتار ذریعہ ہے اور اس کی مزاحمت کی جرأت کسی مسلم سرمایہ دار اور زمیندار کو نہیں ہو سکتی۔ سرمایہ دار کمیونزم کے خلاف ضرور زور کرے گا، لیکن اسلام کے منہ آنے کی جرأت وہ کبھی نہیں کر سکتا، اگر وہ قانون اسلامی کو قبول کرنے سے انکار کریگا تو اس کی جگہ مسلم سوسائٹی میں نہیں بلکہ ریاست کے "اہل ذمّہ" میں ہو گی۔

۷- کفالتِ عامّہ (Public Maintenance)

اسلامی حکومت دستوراً اور اخلاقاً دونوں طرح اپنے شہریوں کو رفاہِ عامہ کے اجتماعی کاموں کے علاوہ بنیادی ضروریاتِ زندگی

کی ضمانت دینے کی پابند ہے، جہاں تک کہ اس کے ذرائع کی وسعت ہو۔ اسلامی بیت المال اکابر کو تنخواہیں جمع کر کے دینے والا ادارہ نہیں ہے، بلکہ وہ پورے شہریوں کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل ہوتا ہے۔ موجودہ دَور کی حکومتیں کفالت عامّہ کی ذمّہ داری نہیں لیتیں، بلکہ صرف رفاہِ عامہ کے کاموں تک اجتماعی خزانے کے مصارف کو محدود رکھتی ہیں۔ فوج، پولیس، تعلیم، صحت، ذرائع آمدورفت وغیرہ کا اہتمام کئے بغیر تو کوئی سلطنت چل ہی نہیں سکتی، اس میں اسلامی اور غیر اسلامی حکومت کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اسلامی حکومت کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ رفاہِ عامہ کے ساتھ کفالتِ عامہ (Public Maintenance) کی ذمّہ داری لیتی ہے اور اس کی طرف سے ہر شہری کو ضمانت دی جاتی ہے کہ زندگی جاری رکھنے کے لوازم میں سے اگر وہ کسی سے محروم ہو گا تو حکومت اور سوسائٹی اسے پورا کرنے کی ذمّہ دار ہو گی۔ اسلامی نظامِ معیشت کا یہ ایک ایسا اصول ہے جس کے ہوتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کے سارے مفاسد کا سدِّباب ہو جاتا ہے اور کمیونزم کے

" دینِ معدہ " کی قدر و قیمت اس کے مقابلے میں ہیچ رہ جاتی ہے۔

نظامِ سرمایہ داری کی مرکزی روح انفرادیت پسندی ہے، یعنی ہر فرد صرف اپنا ذمہ دار ہوتا ہے، لیکن اسلامی نظامِ معیشت میں سوسائٹی ـــ اور اس کی معرفت خوشحال لوگ ـــ ہر ضرورت مند کے بارے میں ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اب اگر کوئی نظام یہ ضمانت دیتا ہے کہ مزدور اور کسان مفلس ہوں، یا کوئی عام شہری بے روزگار ہو، تو اس کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لئے سرکاری خزانہ ہمہ تن حاضر ہوگا۔ تو پھر اس کی ضرورت کیا باقی رہ جاتی ہے کہ تمام افراد کی ملکیتیں سلب کر کے ان کو اسٹیٹ کا مزدور بنا دیا جائے۔

درحقیقت یہ کفالتِ عامہ کا اصول ہی اس بات کا متقاضی ہے کہ مسلم سوسائٹی سے زکوٰۃ و صدقات وصول کر کے ایک مرکزی فنڈ بہم پہنچایا جائے اور اس کا ایک بڑا حصہ افرادِ معاشرہ کی شخصی اور نجی ضروریات کے لئے مخصوص رکھا جائے۔ یہ واضح رہے کہ فقراء و مساکین، ایامیٰ و یتامیٰ اور بیماروں اور معذوروں کی اعانت صرف افراد پر ہی واجب نہیں ہے، بلکہ حکومتِ اسلامی

بدرجۂ اوّل اس کی ذمّہ دار ہے ، کیونکہ اس کے ذرائع و وسائل وسیع تر ہوتے ہیں۔

نبی صلعم اور کفالتِ عامہ | نبی صلعم کا دورِ حکومت دائمی اسوہ ہے۔ آپ نے سائلین اور ضرورتمندوں کو اجتماعی خزانے سے ہمیشہ امداد بہم پہنچائی ہے۔ پھر آنحضورؐ کے شخصی اور سرکاری مصارف کے لئے خمس ، فئے و غنیمت (اور باغ فدک) میں جو حق مقرر کیا گیا تھا اسے آپ نے ہمیشہ بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کے ضرورتمندوں پر صرف کیا ہے۔ زادالمعاد میں بتایا گیا ہے کہ آنحضورؐ اپنی خاص رقم میں سے مقروضوں کا قرضہ ادا کرتے تھے ، کنواروں کی شادیاں کرتے تھے اور اہلِ حاجت کو دیتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ کے پاس ایک بے روزگار شخص سائل بن کر پہنچا تو آپ نے اسے لکڑیاں کاٹ کر بیچنے کے کام میں لگا دیا اور تاکید کی کہ مجھے اپنے معاشی حالات سے مزید مطلع رکھو۔ مدعا یہ تھا کہ اگر کام نہ چل سکا تو پھر کوئی دوسری تدبیر کی جائیگی۔ خود یہ مثال بتاتی ہے کہ بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرنا یا اس بارے میں

ان کی رہنمائی اور تربیت کرنا، اور اگر وہ کامیاب نہ ہوں تو پھر ان کی مالی امداد کرنا اسلامی حکومت کے ذمّے ہے۔

حضرت عمرؓ اور کفالتِ عامّہ | حضرت عمرؓ کے دور میں چونکہ اسلامی نظام پوری طرح برقرار (Establish) ہو چکا تھا، اس لئے کفالتِ عامہ کی مثالیں اس دور میں بہت ہی نمایاں قسم کی ملتی ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ آپ نے اس بات کا سخت اہتمام کیا کہ ممالک محروسہ میں کوئی شخص فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہونے پائے عام حکم تھا — اور اس کی ہمیشہ تعمیل کی گئی — کہ اپاہج، ضعیف، از کار رفتہ، مفلوج وغیرہ ضرورت مندوں کو بیت المال سے وظائف دیئے جائیں۔

۲۔ غربا اور مساکین کے لئے بلا تخصیصِ مذہب حکم تھا کہ بیت المال سے ان کے روزینے مقرر کر دیئے جائیں۔

۳۔ شہروں میں مہمان خانے تعمیر کر دیئے گئے، جہاں مسافروں کو بیت المال کی طرف سے کھانا ملتا تھا (مدینہ منوّرہ کے لنگر خانے

میں تو آپ خود تشریف لے جا کر اپنے اہتمام سے کھانا کھلواتے تھے)

۴۔ اولادِ لقطہ (لاوارث بچے) کے لئے رضاعت و تربیت کے مصارف بیت المال سے ادا ہوتے تھے۔ ابتداً اس سلسلہ میں ۱۰۰ درہم سالانہ فی بچہ مقرر ہوئے، لیکن بعد میں اضافہ کیا جاتا رہا۔

۵۔ یتیموں کی پرورش سرکاری انتظام سے ہوتی تھی ان کی جائدادوں کی دیکھ بھال بھی اسٹیٹ کے ذمّے تھی ــــ اور بالعموم یتیموں کے سرمائے کو تجارت میں لگا کر اسے بڑھانے کا انتظام کیا جاتا تھا۔

۶۔ اسلمؓ (حضرت عمرؓ کے غلام) کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ رات کو گشت کرتے ہوئے مدینے سے تین میل کی دوری پر مقام صرار کے ایک گھر میں بچّوں کے رونے کی آواز آئی۔ دریافت کیا تو معلوم ہؤا کہ بچّے بھوکے ہیں اور سامانِ خوراک ختم ہے اُسی وقت واپس مدینے تشریف لائے اور بیت المال سے آٹا، گوشت، گھی، اور کھجوریں لیں، اور اسلم سے کہا، میری پیٹھ پر لاد دو۔ اسلم نے خود اُٹھانا چاہا۔ آپ نے فرمایا کہ جب تم میرا بار قیامت کو نہیں اُٹھاؤگے

ـــــــــــــــــــ
۱؎ دیکھو حاشیہ ص ۲۲۵ پر۔

تو اب میں تم کو کیوں اُٹھواؤں۔ چنانچہ سامان منزلِ مقصود پہ پہنچا۔ حضرت عمرؓ نے خود چولہا جھونکا، کھانا تیار ہؤا تو بچّوں نے کھایا پیا اور اُچھلنے کودنے لگے۔ بچّوں کی والدہ نے کہا کہ امیرالمومنین بننے کے قابل تم ہو، نہ کہ عمرؓ!

۷۔ ایک مرتبہ مدینہ کے باہر ایک قافلہ آ کے اُترا۔ حضرت عمرؓ عبدالرحمٰن بن عوف کو لے گے وہاں پہنچے اور رات بھران کی حفاظت کے لئے پہرہ دیتے رہے۔

۸۔ ایک مرتبہ ایک بدّو نے اشعار میں اپنے اہل و عیال کے لئے لباس کا مطالبہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے کہا کہ مَیں تمہارا کہنا پُورا نہ کروں تو کیا ہوگا؟ بدّو نے جواب میں یہ شعر مثلّث پڑھا۔

(حاشیہ صفحہ ۲۲۷) حضرت عمرؓ کے اِس جُملے میں یہ اشارہ ہے کہ اگر کوئی حکومت کفالتِ عامہ کی ذمّہ داری ادا نہ کرے اور اس کے شہری بھوک، بیماری اور دوسری محرومیوں میں مُبتلا رہیں تو اسکے چلانے والے خدا کی عدالت میں ہر محروم فرد کے لئے جوابدہ ہونگے۔

تکون عن حالی لتسلینّہ — تجھ سے قیامت کے دن میری نسبت
والواقف المسئول یبتنّہ — سوال ہوگا۔ اور تو ہکا بکا رہ جائیگا۔
اما الی نار و اما جنّہ — پھر یا دوزخ کی طرف جانا ہوگا یا بہشت
کی طرف۔

حضرت عمرؓ یہ سن کر اتنا روئے کہ ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی پھر اپنا ایک کرتہ اسے دیتے ہوئے معذرت کی کہ اس وقت میرے پاس اور کچھ نہیں ہے۔

۹۔ سعید بن یربوع ایک نابینا صحابی تھے۔ ان کو نماز با جماعت میں آنے کے لئے خادم فراہم کر دیا گیا۔

۱۰۔ ایک شخص کا دایاں ہاتھ کٹا دیکھا اور پھر کہنے لگے کہ تم کو وضو کون کراتا ہوگا؟ سر کون دھلاتا ہوگا؟ کپڑے کون پہناتا ہوگا؟ یہ کہہ کر بہت رقت طاری ہوئی اور پھر ایک نوکر مقرر کر دیا اور ضروری سامان فراہم کیا۔

۱۱۔ ایک بوڑھے ذمّی کو مانگتے دیکھا تو فوراً اس کے لئے وظیفہ دینے کا فرمان جاری کیا۔

۱۲۔ ازالۃ الخفا میں ہے:-

وكان ابا العيال حتى ان كان
ليمشي الى المغيبات فيسلم
على ابوابهن ثم يقول
الكن حاجة؟ اذا كنتن
تردن حاجة اشتري
لكن شيئاً من السوق فانى
اكره ان تخدعن فى البيع
والشراء، فيرسلن معه
جواريهن فيدخل السوق
وان وراءه من جوار الناس
وغلمانهم مالا يحصى
فيشتري لهم حوائجهم
ومن كانت ليس عنده
منهم شئ اشترى لها
من عنده واذا قدم الرسول

حضرت عمرؓ غازیوں کے کنبوں کے لیئے، "ابوالعیال" تھے مجاہدین کی غیر حاضری میں ان کی مستورات کے گھروں پر جاتے دروازوں پر جا کر سلام کہتے، پھر پوچھتے کہ کیا کوئی ضرورت درپیش ہے؟ اگر تمہیں کسی طرح کی ضرورت ہو تو میں تمہارے لئے بازار سے سودا لا دوں، کیونکہ میں مناسب نہیں سمجھتا کہ خرید و فروخت میں دھوکا کھاؤ۔ چنانچہ مستورات ان کے ساتھ لونڈیاں بھیج دیتیں اور آپ بازار جا پہنچتے، بہت سے لوگوں کے لونڈی غلام آپ کے ساتھ ہوتے اور آپ ان کی ضروریات خریدتے، اگر کسی کے پاس ضروریات خریدنے کیلئے کچھ نہ ہوتا تو اسے اپنے پاس سے خرید کر دیتے اور جب کبھی کوئی قاصد کسی لشکر سے

من بعض البعوث يبلغهن
هو بنفسه بكتب ازواجهن
ويقول لهن ان ازواجكن
في سبيل الله وانتن في بلد
رسول الله، ان كان عند
كن من يقرأ والا فادنين من
الباب حتى اقرأ لكن ثم يقول
رسولنا يخرج يوم كذا وكذا
فاكتبن حتى نبعث بكتبكن ثم
يدور عليهن بالقراطيس
والدواة فمن كتبت منهن
اخذ كتابها ومن لم تكتب
قال هذا قرطاس ودواة ادني

آتا تو آپ بہ نفس نفیس ان کے گھروں
تک ان کے شوہروں کے خطوط پہنچاتے
اور ان سے فرماتے کہ تمہارے شوہر
خدا کی راہ میں جہاد کر رہے ہیں اور تم رسول اللہ
کے شہر میں ہو۔ پس اگر تمہیں کوئی خط پڑھ
دینے والا میسر ہو تو خیر، ورنہ دروازے
کی اوٹ میں آؤ تاکہ میں تمہیں پڑھ کے[1]
سنا دوں۔ پھر فرماتے کہ ہمارا قاصد
فلاں فلاں دن روانہ ہونے والا ہے
سو تم اس کی روانگی سے پہلے پہلے اپنے
خطوط لکھ رکھو تاکہ ہم تمہارے خطوط
روانہ کر سکیں۔ پھر آپ کاغذ قلم دوات
لیکر ان کے گھروں کا دورہ کرتے اور جس

---

[1] یہ تھا اسلامی پردہ داری کا تقاضا، کجا کہ آج حکمرانوں کے سامنے لڑکیاں ناچتی اور تھرکتی ہیں۔

من الباب فاملی فیمہ
کذا وکذا بابا و
یکتب لاھلہ ثم
یبعث بکتابھنّ۔

کسی نے خط لکھ رکھا ہوتا اُس سے لے آتے اور جس
نے نہ لکھ رکھا ہوتا اسے کہتے یہ ہے
کاغذ اور قلم دوات، دروازے کے
قریب ہو جاؤ اور مجھے لکھواؤ۔ اسی طرح
کئی دروازوں پہ جاتے اور اہل خانہ کے
پیغام لکھتے اور پھر ان خطوط کو بھجواتے۔

اس حوالے کو پڑھتے ہوئے آدمی پر رقّت طاری ہو جاتی ہے ،کہ کس درجے کے شفیق لوگ تھے جن کے ہاتھوں اسلامی نظام چلا اور آج کی حکومتوں میں غربا و عوام کا کیا حال ہے کہ ان کی مزاج پرسی تک کرنا عمایدِ حکومت پر بار ہوتا ہے ، کجا کہ وُہ ایک ایک کی ضرورتیں پوری کرتے پھریں۔

۱۳۔ حضرت عمرؓ کی طرف سے جُملہ حکام کو رعایا کی بیمار پُرسی کے لئے سخت تنبیہہ تھی۔

۱۴۔ سنہ ۱۸ھ کے قحط کے زمانے میں بیت المال کا تمام نقد و غلّہ عوام پر صرف کر دیا۔ پھر صوبوں سے طلب فرمایا۔ قحط زدہ عوام کی فہرستیں تیار کرائیں، ان کی ضروریات۔ نام بہ نام درج رجسٹر کرائیں۔ اور ان کے لئے "قراطیس" (Ration Cards) مہر لگا کر جاری کئے۔

قراطیس کے اندراج کے مطابق مقررہ مقدار غلّہ دی جاتی تھی۔ ہر روز ۲۰ اونٹ ذبح کرا کے اپنے اہتمام سے قحط زدوں کو کھانا کھلاتے تھے[1]

ان مثالوں سے واضح ہے کہ اسلامی حکومت کی کفالتِ عامہ کی ذمہ داریاں کس حد تک وسیع ہیں۔ یہاں ایک واقعہ بیان کرنا ضروری ہے۔ حضرت عمرؓ جب سفرِ شام کے لئے نکلے تھے تو واپسی پر ایک خیمہ دیکھا۔ قریب گئے تو ایک بڑھیا نظر آئی۔ اس نے آپ کو پہچانے بغیر شکایت کی کہ حکومت کی طرف سے اسے کوئی مالی امداد نہیں پہنچی۔ حضرت عمرؓ نے معذرت کی کہ آخر عمرؓ کو اتنی دُور سے تمہارا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ اس کا جو جواب اس عورت نے دیا وہ کوئی بڑے سے بڑا فاضلِ سیاسیات بھی نہ دے سکیگا کہ:

"جب اُس کو رعایا کا حال معلوم نہیں تو خلافت کیوں کرتا ہے"؟

یہ فقرہ اسلامی حکومت کی کفالتِ عامہ کی ذمہ داریوں کا تصوّر دلانے کے لئے کافی ہے۔ حکومت خود اس کی ذمّہ دار ہے کہ وہ

---

[1] اس موقع پر آپ نے اپنی خوراک کا معیار قحط زدہ لوگوں کے برابر کر دیا تھا اور فرماتے تھے جب تک ہر فردِ رعیّت کو گندم کی روٹی اور روغن زیتون نہ ملے گا، میں بھی نہ کھاؤں گا۔

ضرورت مندوں سے تعارف حاصل کرے۔ اور اُن کی ضروریات معلوم کرے ورنہ اس کے کارکن اس قابل ہیں کہ وہ معزول کر دیئے جائیں۔

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز اور کفالتِ عامّہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بنو امیّہ کے ابتر نظام کو اختیار پا کر از سرِ نو درست کیا تھا۔ آپ کے دورِ روشن کا واقعہ ہے کہ غرباء کو سرکاری لنگر سے کھانا کھلانے کا انتظام تھا۔ ایک مرتبہ محاسب یہ عرض کرنے حاضر ہوا کہ اگر لنگر جاری رہا تو بیت المال چند روز میں خالی ہو جائے گا۔ آپ نے جواباً فرمایا کہ لنگر جاری رہے گا اور بیت المال اگر خالی ہو جاتے تو ہو جائے اس میں بھُس بھر دینا۔ مدعا یہ تھا کہ بیت المال ہے ہی اس لئے کہ غربائے ملک کی ضروریات کا کفیل ہو، یہی کام نہ ہوا تو اسے بھر کے رکھنے کی وجہ کیا ہے!

بحث کا ماحصل پاکستان کے حالات کو موجودہ دورِ تمدّن کے تقاضوں کے ساتھ سامنے رکھتے ہوئے اوپر کی ساری بحث کی روشنی میں جو نتائج اخذ ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ:-

(۱) ہماری حکومت کے لئے ایک مستقل محکمہ بندی کر کے اس امر کا

انتظام لازم ہے کہ ملک کے تمام بیواؤں، یتیموں، بیماروں، لاوارث بچّوں، اپاہجوں اور نابیناؤں کی فہرست اس کے سامنے ہو اور اُن کی ضروریات کا باقاعدہ حساب مرتّب رہے۔ اور ان ضروریات کی بہم رسانی کا انتظام ہو

(۲) روٹی، کپڑے، دوا، مکان، سواری، خادم یا اور کسی طرح کے ساز و سامان کی جہاں بھی احتیاج پائی جائے، بروقت فراہم کرنے کا نظم جاری ہو۔

(۳) ملک کے بیروزگاروں کو روزگار فراہم کرنے کے لئے دفاتر اور ذرائع و وسائل مہیا کئے جائیں۔ اور جب تک ان کو کام نہ مِلے اُن کو وظائف دے کر رفاہِ عامہ کے کاموں میں استعمال کیا جائے یا انہیں صنعتی و حرفتی تربیت دلا کر اور سرمایہ و آلات فراہم کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا کیا جائے۔ یہ ہے معاشی ناہمواریوں کو دُور کرنے کی ایک عملی صورت جسے اسلامی نظام کے داعی نافذ کرنا چاہتے ہیں اور جسے نافذ کئے بغیر کوئی حکومت پوری طرح اسلامی حکومت ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ہمیں بتایا جائے کہ جس نظامِ زندگی میں عوام کی

معاشی دستگیری کا ایسا معقول انتظام موجود ہو اس سے بہتر انتظام کونسا ہوگا۔ اور ہم کمیونسٹ حضرات سے بھی دریافت کرتے ہیں کہ اس انتظام سے ان کو کیا اختلاف ہے۔

۸۔ رفاہِ عامّہ

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، کفالتِ عامّہ کی طرح رفاہِ عامّہ بھی اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے۔ بلکہ یہ بھی درحقیقت کفالتِ عامہ ہی کا ایک حصّہ ہے۔ ذرائع آمد و رفت، آبپاشی کے مسائل، زرعی اور صنعتی ترقیوں کے لئے مختلف انتظامات، رسل و رسائل کے انتظامات، تعلیم، صحّت، انصاف اور جان، مال، عزّت و آبرو کی نگہداشت وغیرہ اُمور کی ذمّہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں اسلامی حکومت اپنا ایک مخصوص مسلک رکھتی ہے۔

اسلامی حکومت میں انصاف کے حصول کے لئے کسی قیمت کی ادائی کا کوئی قاعدہ کسی دور میں اختیار نہیں کیا گیا کہ جو اتنی کورٹ فیس ادا کر سکے (اور اس کے ساتھ رشوتیں بھی دے سکے) صرف

وہی انصاف پا سکے۔ بخلاف اس کے اسلامی حکومت کا عدالتی نظام بلا فیس چلتا ہے، اور اس میں جج یا فریقینِ مقدمہ کو قانونی مشورہ بہم پہنچانے کے لئے "آزاد مفتی" بھی سرکاری بیت المال کے صرف پر کام کرتے ہیں۔

اِس طرح اسلامی نظامِ تعلیم بھی دکانداری کے اصُول سے بالکل پاک رکھا گیا ہے۔ اس میں فیس کا طریقہ نہیں کھپ سکتا کہ جو زیادہ مال رکھتا ہو صرف اس کے بچّے تعلیم پا سکیں، بلکہ دین و دنیا کی کم سے کم ضروری تعلیم تو حکومت اپنے ہر شہری کو مفت بہم پہنچانے کی ذمہ دار ہے۔ اس مقصد کے لئے اسکول، کالج، لائبریریوں، دار المطالعے گشتی کتب خانے، تعلیمی فلمیں، ریڈیو سننے کے عوامی مراکز، وغیرہ کا جا بجا انتظام کرنا خود حکومت کا فرض ہے۔

پھر جہاں تک صحت کے تحفّظ کا تعلق ہے، یہ بھی رعایا کی جانوں کی حفاظت کے فوجی انتظام کی طرح امیر غریب ہر ایک کے لئے عام ہونا چاہئے۔ یہ ظلم ہے کہ صرف فیس معائنہ اور قیمت ادویات ادا کر سکنے والوں کے لئے حکومت حفظانِ صحت کے انتظامات

کر دے، لیکن جو لوگ مُفلس ہوں ان کو بیماری اور موت کے حوالے کر دیا جاتے کہ وہی اُن کی چارہ گری کریں۔ اسلامی حکومت کے تحت صاحبِ استطاعت لوگوں کو حفظانِ صحت کے جتنے انتظامات بالمعاوضہ فراہم کئے جائیں، لازم ہے کہ وہ سارے کے سارے غُربا کو مفت فراہم ہوں۔ ہمارے ایک غریب سے غریب شہری کو حق ہونا چاہیئے کہ وُہ اپنے بچّوں کے طبّی معائنے، معالجے، اپریشن، اور دوا اور پرہیز کے لئے بہتر سے بہتر انتظامات سے بلا روک ٹوک استفادہ کر سکے۔ وہ اگر کسی ہسپتال کے خالی بستر (Bed) کو حاصل کرنے کے لئے پہلے پہنچا ہو تو ملک کا رئیس سے رئیس شخص اس کی باری چھین نہ سکے۔ انتظامات پورے عوام کے لئے مساویانہ ہونے چاہئیں، خواہ ان کا معیار پست ہو یا بلند!

یہ کام حکومت کا ہے کہ وہ مصارف کے لئے مالیات کو درُست طور پر منظم کرے۔ امراء پر ٹیکس کا بار ڈالے اور مزدوروں اور کسانوں اور ملازموں کے مصارفِ تعلیم و علاج کے بِل ان کے زمینداروں، کارخانہ داروں اور آقاؤں سے وصول کرے۔

۹۔ زکوٰۃ اور اُس کی معاشیاتی اہمیّت

اسلامی حکومت کے کفالتِ عامہ اور رفاہِ عامہ کے انتظامات کا دارومدار مالیات کے حسن نظم پر ہے، اُس کی ریڑھ کی ہڈی زکوٰۃ ہے جیسے کہ سُود نظامِ سرمایہ داری کی اور قومی ملکیّت کمیونسٹ نظام کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ لیکن قانونِ وراثت ہی کی طرح "زکوٰۃ" کا نام لینے پر بھی ہمارے بہت سے کمیونسٹ فکر حضرات "آں اُوں" کر کے رہ جاتے ہیں اور اس ذریعۂ انتشارِ دولت کی ماہیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اس سے کسمساتے ہیں اور یہ رائے دیتے ہیں کہ آج کل کے مسائل پُرانے زمانہ کے اس ذریعے سے حل نہیں ہو سکتے۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے مسلم علمائے معاشیات میں سے کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ زکوٰۃ کی ماہیت اور اس کے اثرات کو معاشی نقطۂ نظر سے اعداد و شمار کے ساتھ ناپے تولے اور پھر ایک قطعی فیصلے پر خود بھی پہنچے اور دوسروں کو پہنچائے۔ اس کمی کے مدِ نظر میں نے کچھ عرصہ پیشتر زکوٰۃ کا معاشیاتی جائزہ اعداد و شمار کی روشنی میں لینا چاہا تھا، لیکن وہ

کام بعض وجوہ سے نامکمّل رہا۔ اب انشاء اللہ اسے مستقبل قریب میں تکمیل دونگا

پاکستان اور زکوٰۃ | تاہم مَیں نے ایک رَف (اندازہ) اخبار "تسنیم" مورخہ ۴ر مارچ ۱۹۴۹ء میں زکوٰۃ کی اس مقدار کا پیش کیا ہے جو ۱۹۳۵ء کے اعداد وشمار کی رُو سے ایک سال میں صرف پاکستان سے برآمد ہونی چاہیئے۔ اس اندازے کے بارے میں چند باتیں کہہ دینا ضروری ہیں۔

۱۔ یہ اندازہ ۱۹۳۵ء کے اعداد وشمار کے مطابق ہے، لیکن کہیں کہیں ۳۷ - ۱۹۳۶ء کے اعداد وشمار بھی لئے گئے ہیں۔

۲۔ غیر ملکی سرمائے کی مقدار کاروباری سرمایوں میں جو کچھ بھی ہو، اس کا زیادہ سے زیادہ اندازہ کرتے ہوتے نصف حصّہ مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔

۳۔ کل انڈیا کا یکجائی اندازہ کرنے کے بعد اس میں سے ۱/۵ حصہ پاکستان کا متعیّن کر لیا گیا ہے۔

۴۔ جہاں اعداد وشمار نہیں مل سکے وہاں سرسری تخمینہ سے کام

لیا گیا ہے۔

(۵) اندازہ بحیثیت مجموعی "کم سے کم" قسم کا ہے۔

اس طرح جو اندازہ کیا جا سکا ہے وہ بہر حال ۳۰ کروڑ روپیہ سالانہ سے اوپر ہے۔ یہ ۳۰ کروڑ ہر سال خوشحال طبقہ سے ضرورتمند طبقہ کی طرف منتقل ہوتا رہے گا۔ تا آنکہ دونوں مساوات کی حالت پر آ جائیں۔

صرف زکوٰۃ کا منصوبہ | اگر اس مقدارِ زکوٰۃ کو ایک معقول منصوبہ بندی (Planning) کے ساتھ دس سال تک صرف کیا جائے تو

لہ زکوٰۃ کی حقیقت کے بارے میں یہ جان لینا چاہئے کہ یہ عام ٹیکس نہیں ہے بلکہ اس کی شرح اور اس کے مصارف کتاب و سنت سے مستقل طور پر متعین ہیں اور یہ بنیادی عبادات کا اہم رکن ہے۔ زکوٰۃ کا مقصد اسٹیٹ کی ساری ضروریات کو پورا کرنا نہیں بلکہ اس کا مرکزی مدعا رفاہِ عامہ کے ادارات اور کفالتِ عامّہ کے انتظامات کو قائم کرنا اور ملک کے ہر ضرورت مند فرد کو ضروریات بہم پہنچانے کیلئے ایک مضبوط فنڈ مہیا کرنا ہے۔ پھر زکوٰۃ کی ادائی انفرادی معاملہ نہیں ہے، بلکہ اسلامی حکومت اس کے وصول و صرف کا ویسا ہی انتظام کرنیکی ذمہ دار ہے جیسے کہ مالیاتِ عامّہ Public Finance کے دوسرے پہلوؤں کا انتظام وہ کرتی ہے۔

سوسائٹی کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ مثلاً اسی ۳۰ کروڑ روپے کی رقم کو لیجئے اور اس کے دو حصّے کر دیجئے :۔

(۱) ۱۵ کروڑ ان مصارف کے لئے جو حکومت کے ادارات افادۂ عمومی کی معرفت غربا کے لئے کئے جاتے ہیں۔ مثلاً تعلیم، حفظانِ صحت، عدالت وغیرہ۔

(۲) ۱۵ کروڑ براہِ راست امداد بہم پہنچانے کیلئے مخصوص ہونگے۔

اس مؤخرالذکر مقدار کو پھر دو گونہ صورتوں میں صرف کیا جاسکتا ہے۔

(ا) مستقل روزگار بہم پہنچانے کے لئے۔

(ب) وظائف دینے اور وقتی امداد بہم پہنچانے کے لئے۔

مستقل روزگار کے سلسلے میں تین صورتیں زیادہ اہمیّت رکھتی ہیں

اوّل : کسانوں اور زراعت پیشہ لوگوں کو جو "بے زمین" ہوں یا کم رقبہ رکھتے ہوں اُن کو قطعاتِ اراضی خرید کر دیئے جائیں۔ اس مقصد کے لئے اگر ½ کروڑ روپیہ سالانہ صرف کیا جائے تو ۴ ایکڑ فی قطعہ کے حساب سے ۱۰۰۰۰ ایسے قطعات سالانہ خرید کر دس ہزار کنبوں کو فراہم کئے جاسکتے ہیں جن کی قیمت ۲۰۰ فی ایکڑ

ہوگا اس صرف سے غیر مزروعہ رقبوں کو مزروعہ بنایا جا سکتا ہے۔ گویا سالانہ ۳۰ ہزار ایکڑ زمین غربا کو خرید کر یا مزروعہ بنا کر دی جا سکتی ہے۔

دوم:۔ فنڈ کا دوسرا حصہ بقدر ا کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ کارخانوں کے قیام کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے جن میں غریب اور حاجت مند لوگوں کو کارکن بھی بھرتی کیا جائے اور پورا عملہ کار ان کا مالک ہو۔ حکومت صرف کامیابی سے ان کو چلا دینے کے لئے دو ایک سال نگرانی اور تربیت کا فرض انجام دے۔ اگر اعلیٰ درجہ کے بڑے کارخانے قائم کئے جائیں تو ایک لاکھ روپیہ فی کارخانہ سرمایہ لگا کر ۱۵۰ کارخانے سالانہ قائم ہو سکتے ہیں۔ ان کارخانوں میں سالانہ ۱۵۰۰۰ افراد اور ان کے ساتھ ان کے اسی تعداد کے کنبے کھپائے جا سکتے ہیں۔

سوم:۔ فنڈ کا تیسرا حصہ ۲ کروڑ روپے کا اگر تجارتی سرمایہ فراہم کرنے کے لئے مخصوص کیا جائے اور چھوٹے پیمانے کے کاروبار کے لئے ایک ہزار روپیہ فراہم کیا جائے تو سالانہ ۲۰ ہزار افراد

(کنبوں سمیت) گذر کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

اب ہمارے پاس ۱۰ کروڑ روپیہ اور باقی ہے۔ اس کو اگر کچھ وقتی اور فوری امداد کے لئے اور کچھ یتیموں، بیواؤں اور بے روزگاروں[1] کو وظائف دینے کے لئے استعمال کیا جائے تو مختلف درجات کے مستحقین میں یوں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ۵ کروڑ روپیہ ایک ہزار روپیہ سالانہ فی کنبہ ۵۰ ہزار کنبوں کے لئے

(۲) دو کروڑ روپیہ ۵ سو " " " " ۴۰ " " "

(۳) ایک کروڑ روپیہ ۲½ " " " " ۴۰ " " "

(۴) ۲ کروڑ روپیہ[2] ا " " " ۲ لاکھ " "

اس سارے حساب کے پیش نظر صرف ایک سال میں تین لاکھ ۷۵ ہزار کنبوں یا (۴ افراد فی کنبہ کے حساب سے) ۱۵ لاکھ افراد کو افلاس کی دوزخ سے نکال کر خوشحالی کی جنت میں بسایا جا سکتا ہے۔

---

[1] جن بے روزگاروں کو حکومت روزگار ملنے تک وظائف دے، ان سے رفاہِ عامہ کے کاموں میں خدمات لیکر دولت عامہ میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

[2] ظاہر ہے کہ بعض کنبے کامل امداد کے مستحق ہونگے بعض جزوی امداد کے۔

اگر یہی عمل ۱۰ سال تک جاری رہے تو ایک کروڑ پچاس لاکھ افراد کو معاشی استحکام کی منزل پر لایا جا سکتا ہے۔ یہ ہے وہ زکوٰۃ جسے حقیر سمجھا جاتا ہے، یہ اگر قانونِ وراثت کے ساتھ شامل ہو جائے تو حیرت انگیز انقلاب بپا ہو سکتا ہے —— بغیر اس کے کہ طبقات کی جنگ ہو اور خون کا کوئی ایک قطرہ بہے۔

<u>دوسرے صدقات</u> | زکوٰۃ صدقۂ واجبہ ہے۔ اس کے علاوہ جو صدقات مسنون اور مستحب ہیں، وہ ایک تربیت یافتہ مسلم سوسائٹی میں بالعموم زکوٰۃ سے بڑھ جایا کرتے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ اگر ہم اپنی سوسائٹی کی تربیت حکومت کے وسائل سے اسلامی نقشے پر دو تین سال تک کریں تو حالات میں نمایاں ارتقا نہ ہو جائے۔ اِن دوسرے صدقات میں سے قابلِ ذکر یہ ہیں:-

(۱) صدقۂ فطر (۲) قربانی (۳) نذر (۴) کفارۂ یمین (۵) کفارۂ معصیت کبیرہ وصغیرہ (۶) ہدیۂ صلوٰۃ وصوم (فوت شدہ) (۷) قرضِ حسنہ کی معافی (۸) اطعام مسکین (۹) صدقہ برائے سائل (۱۰) اوقاف (۱۱) عام صدقاتِ جاریہ۔ وغیرہم۔

اِن سارے صدقات سے اگر بالفرض گھٹیا حالات میں بھی امیر طبقہ سے غریب طبقہ میں سالانہ ایک رقم بقدر ۰ اکرو ڑ بھی منتقل ہونے لگے تو زکوٰۃ کا اثر اور زیادہ دُور رس ہو جانا چاہئے، پھر اگر سوسائٹی دس سال تک تربیت پاتی رہے تو یقیناً صدقاتِ غیر واجبہ کی مقدار زکوٰۃ کے برابر ہو جانی چاہئے۔

مقامِ غور و فکر

اِس ساری بحث کے مطالعہ کے بعد غور فرمائیے کہ اگر ایک نظامِ اجتماعی ایسا عملاً برپا ہو جس میں!

(۱) عام طور پر دولت پرستی کی بجائے خدا پرستی اور تعمیرِ اخلاق پر توجہات مرتکز ہوں،

(۲) معاشیاتی اخلاق کی تعمیر اس طرح پر کی گئی ہو کہ سرمایہ دارانہ ناہمواریوں کا پیدا ہونا ممکن نہ رہے،

(۳) سُود، قمار، ذخیرہ اندوزی، بلیک مارکیٹ، سٹے وغیرہ کا سدِّباب ہو چکا ہو۔

(۴) اسراف و تعیّش کے دروازے بند کئے جا چکے ہوں اور تقریباتِ زندگی کو بالکل سادگی کی سطح پر لایا جا چکا ہو۔

(۵) ملازمین کی تنخواہوں کا معیار اعتدال کے اصول پر قائم ہو۔

(۶) اہلِ محنت کے حقوق متعیّن ہوں اور ان کا قانونی و اخلاقی تحفظ ہو۔

(۷) ایک ضرورت مند کو اس کے رشتہ دار، اس کے پڑوسی اور عام مسلمان ہر وقت مدد بہم پہنچانے کے لئے تیار ہوں۔

(۸) حکومت اہلِ حاجت کی ضروریات کی کفیل ہو اور بے روزگاروں کی سرپرستی کرے،

(۹) قانونِ وراثت جائدادوں کو بار بار ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھیلاتا چلا جاتا ہے،

(۱۰) زکوٰۃ وصدقات کی ایک بڑی مقدار ہر سال اوپر کے طبقے سے نیچے کے طبقے میں منتقل ہوتی رہے،

(۱۱) اور ہر فرد دوسرے کے ساتھ اخوّت ومساوات کے روابط رکھتا ہو تو بتایا جائے کہ اس میں معاشی ناہمواریاں یا فاقہ وافلاس، یا تقسیمِ طبقات کدھر سے دخل انداز ہو سکتی ہے؟ —— پس اصل سوال یہ ہے کہ اس نظامِ اجتماعی کو عملاً برپا کرنے — اور جلد از جلد برپا کرنے — کی فکر کی جائے اور اسی کی دعوت لے کے ہم کھڑے ہوئے ہیں۔

حرفِ آخر —— یہ بات خوب اچھی طرح آپ کو سمجھ لینی چاہئے۔

کہ یہ نظام جس کا خاکہ آپ کے سامنے بیان کیا گیا ہے، اس کا قیام کبھی بھی بجز اس کے ممکن نہیں ہے کہ اس نظام کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق اسلام کو جاننے، سمجھنے اور اس کی مشین کو چلا سکنے کی صلاحیتیں رکھنے والی ایسی قیادت برسرکار ہو، جو کسی غیر اسلامی نظام سے مرعوب نہ ہو۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ پوری تاریخ انسانی میں ایک مثال بھی اس بات کی نہیں مل سکتی کہ اسلامی نظامِ زندگی اسلام کو نہ جاننے والوں اور اسلام پر نہ چلنے والوں کی قیادت میں بپا ہو سکا ہو، بلکہ چلتے چلاتے اسلامی نظام پر جب کبھی اس کے معیار سے گری ہوئی قیادت مسلط ہوئی ہے، تو اس کے بخیے ادھڑ گئے ہیں۔ بخلاف اس کے جب کبھی بگڑے ہوئے حالات میں کوئی صالح قیادت بروئے کار آگئی ہے تو نظامِ زندگی کی چولیں از سرِ نو اپنی جگہ پر درست بیٹھ گئی ہیں۔ پس پاکستان اسلام کے معیار کے مطابق ایک صالح قیادت کو سامنے لانے میں جتنی دیر کرے گا، اتنی ہی دیر اسلام کے نظامِ حیات کے نفاذ میں لگے گی۔ یہ سمجھ لیجئے کہ اب حالات

ایسے نہیں ہیں کہ اسلام کو برسرِ اقتدار کرنے اور اس کے نظام کو عملاً جاری کرنے میں دیر کی جاتے ۔ آج کمیونزم کا سیلاب آپ کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے ۔ اس سیلاب کو محض اپنی "قرار داد مقاصد" کے خوشنما لیبل کا واسطہ دلا کر اور اپنے اکابر کی من موہ لینے والی تقریروں کا حوالہ دے کر آپ نہیں روک سکتے ، اسے صرف اسلام روک سکتا ہے ۔

آج جو صورتِ حالات ہمارے ہاں کارفرما ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے نام کا بورڈ تو ریاستِ پاکستان کے دروازے پر لگ گیا ہے ، لیکن اس کے اندر وہی سرمایہ دار ، جاگیردار ، نواب ، چودھری ، خطاب یافتہ حضرات اور عہدوں کا کاروبار کرنے والے لوگ سرمایہ دارانہ نظام کی کلیں نصب کئے زرگری کر رہے ہیں ۔ نہ کسی اصولِ کار اور طریقِ کار میں تغیر آیا ہے ، نہ زاویہ ہائے نگاہ اور اخلاق میں کوئی فرق پیدا ہوا ہے ، نہ عادات و اطوار میں کوئی تبدیلی عیاں ہے ، نہ دفتری نظام کے ڈھانچے میں کوئی ردو بدل ہوا ہے ۔ اس حال میں کیا یہ ممکن ہے کہ قانونِ قدرت کی

بے لحاظ طاقتوں کو ہم اسلام کا بورڈ دکھا کر دھوکہ دے سکیں؟ اس گھٹیا چال کو چلنے کا نتیجہ بجز اس کے کچھ ہو نہیں سکتا کہ ہمارے معاشی مظلوموں کے جذبات کا سیلِ رواں جب بند توڑ کے موجزن ہو تو جہاں موجودہ نظام کو بہا لے جائے وہاں اسلام کے بورڈ کو بھی ساتھ ہی لے جائے۔ خالی بورڈ آخر کیا کرامات دکھا سکتا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ہماری موجودہ قیادت جو اسلام کے بجائے دلوں کی گہرائیوں میں مغربی نظامِ حیات پر ایمان رکھتی ہے اور اسی میں اپنی خواہشات کے لئے سارے راستے کھلے پاتی ہے، اور جسے نظامِ اسلامی کے مطالعہ کا کوئی موقع نہیں ملا، اور جس کے پاس نظامِ اسلامی کو چلانے کیلئے اخلاقی صلاحیتیں نہیں، وہ موجودہ نظام کو کسی قدر نئے پالش کے ساتھ پاکستان پر بالجبر مسلط رکھنا چاہتی ہے اور تغیّر و اصلاح کی طاقتوں کا راستہ آخر دم تک روک رکھنا چاہتی ہے۔ پس اب کوئی صورت اسلامی نظام کے عملی نفاذ کی اس کے سوا نہیں ہے کہ اس قیادت کو آنیوالے انتخابات میں برطرف کر کے نئی صالح قیادت کو

بروئے کار لایا جائے۔

ہمارے موجودہ نظام اور ہماری موجودہ قیادت کے لئے قانونِ فطرت کی نگاہ میں اب کوئی معقول وجہ بقا باقی نہیں رہی۔ اب انقلاب بالکل مقدر ہو چکا ہے۔ امکانات اسی بات کے زیادہ ہیں کہ یہ انقلاب اسلامی ہو گا۔ لیکن اگر ہمارے عوام نے اسلام کو جلد از جلد برسرِ اقتدار لانے کے لئے متحدہ کوشش نہ کی تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اسلام کا صحیح راستہ کھلا نہ پا کر انقلاب کی رو کمیونزم کے غلط راستے سے سوسائٹی میں داخل ہو جائے۔ اور ملک ایک بلا کے پنجے سے نکل کر ایک دوسری بلا کی گود میں چلا جائے۔

پس جماعتِ اسلامی ہر مسلمان کو دعوت دیتی ہے کہ وہ آگے بڑھے اور اسلامی نظام اور اسلامی قیادت کو برپا کرنے کے لئے جماعتِ اسلامی کی جدوجہد میں دل و دماغ سے، جسمانی قوتوں سے، وقت اور مال سے، زبان اور قلم سے پورا پورا تعاون کرے۔

چند سوالات

اَور

اُن کے جوابات

سود، بنکنگ اور بین الاقوامی معاشی روابط

سوال :- میں معاشیات کا ایک طالب علم ہوں اور اس سلسلہ میں آپکی جماعت کے اسی موضوع کے مضامین کو پڑھنے کا اکثر اتفاق ہوتا رہتا ہے آپ کے رسالہ ترجمان القرآن جلد ۳۲ عدد ۲ شائع شدہ ماہ اگست میں آپ کا مضمون "معاشی ناہمواریوں کا اسلامی علاج" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ جن مشکل مسئلوں کو آپ نے اس میں لیا ہے، اس میں سُود کا مسئلہ بھی ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ علاوہ ازیں کہ سُود صریحاً کتاب و سنّت کے احکامات کے خلاف ہے، اس سے معاشی ناہمواریاں بھی پیدا ہوتی ہیں، کیونکہ اشیا بنانے والے اور تاجر سُود کی رقم کو چیزوں کی قیمت میں شامل کر دیتے ہیں، جو بالآخر عوام کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس سے ظاہر ہُوا کہ اس سودی نظام کے ماتحت قریب قریب ہر چیز کی قیمت میں سُود کا عنصر شامل رہتا ہے، چاہے وہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن آگے چل کر آپ نے بین الاقوامی تجارت کو لیا ہے اور لکھا ہے کہ جب تک ہم اپنے یہاں اسلامی طرز کو کامیابی سے چلا کر

نہ دکھا دیں، ہمیں بین الاقوامی تجارت میں سود کا وجود برداشت کرنا پڑے گا۔ چنانچہ ترجمان کے صفحہ ۱۲۲ پر سے آپ کا یہ جملہ نقل کرتا ہوں:

"جب تک یہ منزل نہ آجائے، آپ کو اپنے بین الاقوامی مالی و تجارتی روابط میں سود کی آلائش کو اضطراراً گوارا کرنا پڑے گا۔"

آپ اپنے متعدد مضامین میں لکھ چکے ہیں کہ آپ ہر مسئلہ کو خالص اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھیں گے اور آج کل کی دنیا کے ہر اس طریقے کو رد کر دیں گے جو غیر اسلامی ہے ——— چاہے اس میں کتنا ہی دنیاوی نقصان کیوں نہ ہو۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ سود کے وجود کو اس منزل کے آجانے تک اضطراراً کیوں گوارا کیا جائے۔ آخر جو اشیاء غیر ممالک سے یہاں آئیں گی، اُن کی قیمتوں میں سُود کا عنصر بہر حال ضرور ہوگا اور جب ہم ان اشیاء کو خریدیں گے تو گویا اس سودی عنصر کو ادا کیا۔ اسلام میں سُود دینا بھی گناہ ہے، لہٰذا یہ کہاں تک جائز ہوگا۔ براہِ کرم اس شبہے کا ازالہ فرمایئے تاکہ اطمینان ہو۔

جواب:۔ بلاشبہ بحیثیت مسلمان ہمارا فرض یہی ہے کہ ہر وہ چیز جسے اسلام نے حرام ٹھہرایا ہے اس سے ہم اپنے معاشرے کو پاک

کر دیں، چاہے اس میں بظاہر وقتی طور پر کوئی نقصان ہی پہنچتا نظر آئے۔ ورنہ درحقیقت حرام بہر حال مضر ہی ہوتا ہے اور اس کے مفاسد اس کے مفاد کے مقابلے میں بھاری رہتے ہیں۔

یہی تو وہ جذبہ ہے جو ہمیں اس پر مجبور کرتا ہے کہ اپنے ہاں کے بنکنگ سسٹم کو ادھیڑ کر نئے سرے سے بُنیں اور اس کے لئے تیاری کریں، درآنحالیکہ دنیا کی دنیا اس کی موجودہ شکل پر ایمان لاتے ہوئے ہے۔

لیکن ایک پھیلے اور چھاتے ہوئے، بلکہ یوں کہئے کہ رچے بسے سسٹم کو آناً فاناً بدل دکھانے پر کوئی انسانی قوت قادر نہیں ہو سکتی۔ تبدیلی کے لئے تدریج خود ایک قانونِ قدرت ہے اور اسے اسلام نے پُوری اہمیّت دی ہے! چنانچہ ایک فرد کے مسلمان بننے کا معاملہ ہو یا ایک معاشرہ میں نظامِ اسلامی کے دستور مرتب کرنے کا سوال درپیش ہو، دونوں حالتوں میں تدریج ناگزیر ہے۔

اب آپ اگر ذرا تامل سے کام لیں تو خود اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اپنے نظامِ معاشی کو سود کی آلائش سے پاک کرنے کے لئے اگر کوئی عملی پروگرام اختیار کیا جا سکتا ہے تو وہ حسب ذیل تدریج پر ہی کام

کر سکتا ہے۔

(۱) سب سے پہلے شخصی سود خواری کو قطعی طور پر ممنوع ٹھہرا دیا جائے۔

(۲) اس کے بعد ایک نیا بنکنگ سسٹم اصولِ مضاربت یا اصولِ امداد باہمی پر قائم کیا جائے۔

(۳) پھر موجودہ بنکوں کے سرمائے کو نئے نقشے کے بنکوں کی طرف منتقل (Shift) کیا جائے۔

(۴) مذکورہ بالا بین الملکی انقلاب کی تکمیل کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی فضا کو متاثر کرنے کے لئے اپنے بنکنگ سسٹم کی سائنس کو پورے زورِ استدلال کے ساتھ مدون کر کے پیش کر دیا جائے اور اس کی توضیح کے لئے وسیع لٹریچر فراہم کیا جائے، نیز نئے بنکنگ سسٹم کے تحت جو تجربات حاصل ہوں ان کو اعداد و شمار کی روشنی میں دوسری اقوام کے سامنے رکھا جائے۔ یہاں تک کہ وہ اس کے قابلِ عمل (Practicable) بلکہ مفید تر ہونے کی قائل ہو جائیں۔

(۵) اسی دوران میں اُن پر تجارتی دباؤ ڈالا جائے کہ وہ اپنے ہاں یا تو غیر سودی بنکنگ سسٹم خود قائم کریں یا ہمارے بنکوں کی شاخیں

کھولنے کے لئے سہولتیں بہم پہنچائیں اور ہماری اس شرط کو منظور کریں کہ دو طرفہ تجارت درآمد و برآمد غیر سودی بنکنگ سسٹم کی معرفت ہوگی!

اس تدریجی پروگرام کی شق (۵) کے عمل میں آنے تک ہم اپنی تجارت خارجہ کو جاری رکھنے کے لئے بیرونی ممالک کے سودی بنکوں سے قطعی طور پر بے نیاز نہ ہو سکیں گے، اور اس طرح شق (۳) کے تکمیل پذیر ہونے تک ہم خود اندرون ملک میں بھی اپنے نظام صنعت و تجارت کو سود سے کلیتہً پاک نہ کر سکیں گے۔

اصولی حیثیت سے جہاں تک بین الاقوامی معاملات کا تعلق ہے۔ یہ بات آپ کو ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ دنیا جو ایک شہر کی حیثیت رکھتی ہے، اس میں اگر چاروں طرف غیر اسلامی نظاموں کے مفاسد کا سمندر موجیں مارتا رہے تو اس سمندر میں اسلامی ریاست کے جزیرے کا ساحل بہرحال موجوں کی زد میں رہیگا، اس وجہ سے ایک اسلامی ریاست کا منتہائے کمال اسی صورت میں ظاہر ہو سکتا ہے جب کہ اردگرد کی ساری دنیا اس کے اصولوں سے اثر قبول کرلے ––– اور یہی وہ ضرورت ہے جس کے لئے ایک اسلامی ریاست کا نصب العین ہی

یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ ہمہ تن اقامتِ دین اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک ادارہ ہو۔ وہ ساری دنیا کے لئے ایک روشنی کا مینار، ایک تعلیم کا مرکز، ایک نگرانی کی چوکی اور ایک پولیس اسٹیشن بن جائے حتیٰ کہ پوری دنیا ایک اسلامی ریاست بن سکے!

اس انتہائی کمال کی حالت کو پہنچنے سے پہلے ایک اسلامی ریاست بین الاقوامی معاملات میں جتنے کچھ تعلقات دوسری ریاستوں سے رکھنے پر مجبور ہو اس میں اس کی کوشش یہی ہونی چاہئیے کہ وہ کم سے کم "براہِ راست" قسم کے مفاسد سے اپنے آپ کو بچائے ___ اِلّا یہ کہ کسی شدید طبعی ضرورت کے لئے وہ اضطراراً کسی ایسی صورتِ حالات کو گوارا کرنے پر مجبور ہو جس میں کوئی مفسدہ پایا جاتا ہے۔

مثلاً آپ کو ایک وقت میں غذائی قلت یا قحط کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے اور آپ مجبوراً کسی غیر ملک سے غلہ درآمد کرتے ہیں۔ اس غلہ کی قیمت کی ادائی کے لئے آپ کو ایسے بینکنگ سسٹم کو ذریعہ بنانا پڑتا ہے جو سود کے اصول پر قائم ہے یا آپ کسی جنگ میں مبتلا ہیں اور قوم کی موت وحیات کا سوال درپیش ہے اور اس حال میں

آپ اسلحہ خریدتے ہیں، لیکن نقد ادائی کے لئے روپیہ نہیں رکھتے۔ اور مجبوراً سود پر قرض لیتے ہیں۔ اسی طرح آپ کو معاشی بدحالی کے دور کرنے کے لئے کسی وقت بیرونی سرمایہ کی ضرورت پیش آجاتی ہے اور بیرونی سرمایہ اصول مضاربت پر نہیں ملتا، کیونکہ اس اصول کا عملی تجربہ کسی کو بھی نہیں تو ان سارے مواقع میں آپ اضطرار کی رخصت سے فائدہ اٹھانے پر مجبور ہوں گے!

رہے وہ مفاسد جو براہ راست نہیں ہیں، بلکہ جن اشیاء کو آپ کسی ملک سے حاصل کرتے ہیں، ان کی تیاری اور ان کے مارکیٹ میں آنے کے سسٹم میں پائے جاتے ہیں تو آپ ہر چیز کی تیاری کی ہسٹری اور اس کے پس منظر کی کرید کئے بغیر صرف اتنے پر اکتفا کریں گے کہ جو معاملہ آپ کر رہے ہیں خود اس معاملہ میں تو کوئی اصولی قباحت نہیں۔ ورنہ اگر اشیا کی ہسٹری اور معاملات کے غیر متعلق پس منظر کی کرید میں پڑنا شرعاً ضروری ہو تو پھر دنیا میں کسی غیر مسلم بلکہ کسی بگڑے ہوئے مسلمان سے بھی کسی طرح کا کوئی معاملہ نہیں کیا جا سکے گا ـــــ حالانکہ انبیاء نے کفار و مشرکین سے ہر طرح کے معاملات کئے ہیں۔ خود

نبی صلعم نے غیر مسلموں کے ہاں اُجرت پر کام کئے ہیں اور یہ نہیں دیکھا کہ اُجرت کس مال میں سے دی جا رہی ہے، اور محنت سے جو فائدہ اٹھایا جا رہا ہے وہ کن مقاصد پر صرف ہو گا۔ پھر آپؐ نے غیر مسلموں کی کھانے کی دعوتیں قبول کی ہیں، اور یہ کرید نہیں کی کہ کھانا جس مال سے پکا ہے وہ کس طرح کمایا گیا تھا اور اس کے پیچھے کونسا معاشی نظام کام کر رہا تھا۔

"معاشی ناہمواریوں" میں سُود کے پُورے نظام معاشی کی رگوں میں سرایت کر جانے کی جو توضیح کی گئی ہے، اُس کا اصل مدعا اس غلط نظریئے کی تردید کرنا تھا کہ "بنکوں کا سُود" اُن مفاسد سے پاک ہوتا ہے جو انفرادی سود خواری میں پائے جاتے ہیں۔ اس تصریح سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہو گا کہ اگر کسی ملک کے نظامِ معیشت میں سُود سرایت کئے ہوئے ہو تو اس کی پیداواریں اور مصنوعات خریدی یا استعمال نہیں کی جا سکتیں۔

ان اشارات سے غالباً آپ اصل مدعا کو سمجھ سکیں گے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی نظام کو کتابوں کے اوراق سے نکال کر صفحۂ زمین پر اگر عملاً قائم کرنا ہو تو تدریج ناگزیر ہے اور تدریج بہرحال اس کا تقاضا

کرتی ہے کہ اصلاح کے عبوری دور کے مختلف مراحل کو اضطراراً گوارا کیا جائے۔ بخلاف اس کے اگر عملی حالات سے آنکھیں بند کر کے آپ اٹھیں اور غیر سودی نظامِ معیشت کو قائم کرنے کے لئے ایک صبح کو اچانک آرڈی ننس جاری کر دیں کہ آج سے سودی بنکنگ سسٹم کو بند کیا جاتا ہے اور کل سے غیر سودی بنکنگ سسٹم کام کرے گا تو اس آرڈی ننس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ آپ کا سارا معاشی نظام دھڑام سے زمین پر آ رہے گا اور اس کو از سرِ نو تعمیر کرنے کے لمبے عمل کی طرف توجہات کو دیر تک کے لئے منعطف کرنے کے بجائے اصل سوال یہ پیدا ہو جائے گا کہ جئیں کیسے؟

اجتماعی نظام کی اصلاح و تجدید کے لئے صرف وہی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے جس کے تحت ایک نظام چلتے چلتے بدلتا جائے، کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ چلتے نظام کو روک کر اسے اسکی جگہ سے پہلے اکھیڑ کر ملک سے باہر کسی سمندر میں پھینک دیا جائے اور پھر ایک بنا بنایا نظام کسی کارخانے سے لا کر اس کی جگہ نصب کر دیا جائے۔

یہ الگ بات ہے کہ اصولِ تدریج کی آڑ لے کر ایک طبقہ جس طرح ٹال مٹول سے کام لینا چاہتا ہے وہ خلافِ اسلام ہے۔ ایک مومنِ صادق اضطرار کے مراحل سے جلد از جلد گذرنے کی پوری سعی کرتا ہے اور وہ اسلام کے ظہورِ کامل سے پہلے کی عبوری منزلوں میں سے کسی منزل میں قرار نہیں پکڑتا اور اضطرار کے مواقع سے لذت نہیں لیتا۔

اصولِ سود اور اصولِ مضاربت

سوال۔ آپ حضرات موجودہ بنکنگ سسٹم کے تحت سود کے بار کا عوام کی جیبوں پر پڑنا ثابت کرتے ہیں، لیکن اس کے بجائے اگر اصولِ مضاربت کو نافذ کیا جائے تو اس صورت میں آخر "منافع" کہاں سے آئے گا؟ وہ بھی تو عوام ہی ادا کریں گے۔ پس اگر بغور دیکھا جائے تو نتیجہ برابر رہتا ہے۔

جواب: یہ بات نہیں، دونوں اصولوں کا عمل بالکل مختلف ہوتا ہے سود کے اصول پر جو سرمایہ لیا جاتا ہے اس کے لئے تو یہ

پہلے سے طے ہو جاتا ہے کہ اتنے فیصدی شرح کے حساب سے اتنی رقم صاحب سرمایہ کو دی جاتی ہے، اس وجہ سے صنعت کار یا تاجر اشیاء کی قیمتوں میں اس مقدار سود کو شامل کر کے پھر اپنا منافع اس پر لگاتا ہے۔ گویا ادھر چیز بن کے کارخانے سے نکلی تو اپنی قیمت کے ساتھ "سود" کا بوجھ لے کے آئی یا وہ مارکیٹ میں مستعار سرمایہ استعمال کرنے والے تاجر کے پاس پہنچی اور اُس پہ سرمائے کا سُود لد گیا۔ بخلاف اس کے اصولِ مضاربت کے تحت جو سرمایہ مستعار لیا گیا ہو، اس میں صنعت کار اور تاجر کے سامنے یہ متعین ہوتا ہی نہیں کہ صاحب سرمایہ کو کے فیصدی ادا کرنا ہے، بلکہ اس صورت میں سرمایہ مستعار لینے والوں کو جو کچھ دینا پڑتا ہے وہ منافع حاصل ہو چکنے اور اس کا حساب بن چکنے کے بعد دینا ہوتا ہے اور اس کا اندازہ بھی بعد ہی میں قائم ہوتا ہے۔ منافع زیادہ ہو گا تو صاحب سرمایہ کا حصہ بھی بڑھ جائے گا، کم ہو گا تو اس کا حصّہ بھی کم رہیگا۔ بہرحال اصولِ مضاربت کے تحت سرمایہ دینے والے کا حصہ قیمتوں میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرا فرق اصولِ سود اور اصولِ مضاربت میں یہ ہے کہ جو سرمایہ اصولِ سود پر دیا گیا ہو وہ صنعت کار اور تاجر کے نقصان سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا، بلکہ وہ اپنا کرایہ بہر حال لے کے لوٹتا ہے، اندریں حالات بڑے کاروباری لوگ سود کی چوٹ سہ جاتے ہیں، لیکن چھوٹے کاروباری لیبا اوقات بُری طرح اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بخلاف اس کے اصولِ مضاربت نقصان میں جانے والے کاروبار کے لئے سرمائے کو بے رحم نہیں بناتا، بلکہ وہ سرمائے کو نقصان کے سہارنے میں محنت کا شریک کار بناتا ہے۔

یہ دو فرق اتنے واضح ہیں کہ ان پر کسی مزید تفصیل بیان کی ضرورت نہیں۔

اسلامی نظام میں انشورنس

چراغِ راہ[1] میں "اسلامی اصول پر بنکنگ" کا مطالعہ کر کے بہت مسرت ہوئی۔ میں نے اپنے حلقۂ احباب میں خوب مطالعہ کرایا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ انشورنس کے متعلق بھی چند سطور لکھ دیتے۔ اگر اب بھی

---

[1] ماہنامہ چراغ راہ کراچی۔ شمارہ دسمبر ۱۹۴۸ء

مناسب سمجھیں تو اس بحث کو چراغِ راہ میں پیش فرما دیں۔

جواب:۔ قدرتی طور پر بینکنگ کے مسئلے کے ساتھ انشورنس کا سوال نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، چنانچہ خود میرے پیش نظر تھا بھی یہی کہ اپنے مضمون کے آخر میں ایک دو پیراگراف انشورنس پر لکھ دوں، لیکن جگہ کی قلت کو محسوس کرتے ہوتے اس بحث کو نظر انداز کر دیا۔ اب بہت ہی مختصر طریق سے میں انشورنس کے بارے میں وہ چند اشارات عرض کئے دیتا ہوں جس سے آپ اسلامی نظام میں بیمہ کی نوعیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

(۱) "انشورنس" پر اس حیثیت سے تنقیدی نگاہ ڈالئے کہ یہ مغرب کے نظام سرمایہ داری کا ایک طبعی تقاضا ہے جس نظام میں ہر فرد اپنی ہی معاش پر متوجّہ رہے اور دوسرے افراد کے متعلق اپنی کوئی ذمہ داری محسوس نہ کرے، اور جس نظام میں معاشرہ بہ حیثیت مجموعی افراد کی معاشی مجبوریوں میں سہارا دینے کا کوئی انتظام نہ کر رہا ہو، اس میں "کچھ بچت کرتے رہنے" کا رجحان بھی ضرور پیدا ہوتا ہے اور انشورنس کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے۔

اسلامی معاشرہ ایسے معاشی نظام کے ساتھ قائم ہوتا ہے جس میں ایک فرد کو نہ صرف دوسرے افراد کا اخوت آمیز تعاون حاصل ہوتا ہے، بلکہ حکومت کا پورا بیت المال اس کی پشت پناہی کے لئے موجود رہتا ہے۔ اسلامی نظام میں کسی فرد کو اپنی زندگی کی حد سے آگے سوچنے کی کچھ ضرورت ہی نہیں ہے کہ میرے بچے اور میری آئندہ نسل کیا کھائے گی اور کیا پہنے گی؟ وہاں تو پورے افراد ریاست کا "بیمۂ زندگی" بیت المال میں از خود ہو جاتا ہے۔ پس اسلامی نظام میں تو ہر فرد کی سعی اس پر صرف ہونی چاہئے کہ مملکت کا بیت المال زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو، اور ہر وہ "پائی" جو کسی کے پاس بچت میں رہ سکے۔ اس ملی انشورنس کے مرکز میں پہنچ جائے۔ اس قسم کے مسائل کسی حد تک اگر قابل غور ہیں بھی تو صرف اس عبوری دور کی حد تک ہو سکتے ہیں جس میں موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کا استحالہ ہو اور اسلامی نظام اپنی تکمیلی صورت اختیار کرے۔

(۲) موجودہ "انشورنس" کا نظام ہمارے سودی بنکنگ سسٹم کا ایک حصہ ہے اور اس کے رگ و پے میں "ربٰو" کا زہر پوری

طرح جاری وساری ہے، علاوہ بریں یہ اگرچہ "قمار" نہیں ہے، لیکن اس میں شائبۂ "قمار" ضرور پایا جاتا ہے، یعنی بعض لوگوں کے مال سے ایک شخص خاص کو ادائی کی جاتی ہے۔ ناگزیر ہے کہ مسلم سوسائٹی انشورنس کو ان دونوں آلودگیوں سے پاک کرے۔ ہمارا بنکنگ کا نظام اگر اسلام کے اصولوں پر استوار ہو جاتے تو "ربٰو" کے زہر کے توسرچشمے بالکل بند ہو جائیں گے۔ اس کے بعد قمار کے زہر سے انشورنس کو پاک کرنا زیادہ مشکل نہیں رہ جاتے گا۔

(۳) جہاں تک "بیمۂ زندگی" کا تعلق ہے، اس کا تصوّر اسلامیت سے اتنا بعید ہے کہ اسے تو عبوری دور میں بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی کوئی حقیقی ضرورت ہی باقی رہ سکتی ہے جبکہ یہاں اسلامی نظام وجود میں آ رہا ہو! مسئلہ صرف "کاروباری قسم کے بیمہ کا ہے۔ اور اس کے لئے سود اور قمار سے پاک ایک بہتر نظام اختیار کیا جا سکتا ہے:

(۴) انشورنس سسٹم کے بجائے دراصل اسلامی نظام کے قیام کے بعد جو چیز گوارا کی جا سکتی ہے، وہ "امداد باہمی" کے ادارے

ہیں۔ امداد باہمی کے اداروں اور انشورنس کمپنیوں کے ڈھانچے میں
ایک اصولی فرق یہ ہے کہ آخر الذکر سرمایہ داروں کے کاروبار ہیں اور
اول الذکر کا کاروباریوں کی مداخلت سے آزاد ہونا لازم ہے دوسرا
فرق دونوں میں یہ ہے کہ انشورنس کمپنیوں کا اصول یہ ہے کہ جو
جس تناسب سے دے، اسی تناسب سے لے، لیکن امداد باہمی
کے ادارات کا سسٹم ایک دوسرے اصول پر چلے گا کہ جو جتنا
دینے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اتنا دے اور جسے جس طرح کی ضرورت
درپیش ہو، اس کے مطابق مدد حاصل کرے۔ مثلاً ایک کارخانے
کے کارکن امداد باہمی کا ادارہ قائم کرتے ہیں جن میں مینجر بھی ہے،
کلرک بھی ہیں، مزدور بھی ہیں اور چوکیدار اور چپراسی بھی ہیں۔ جن
کی تنخواہوں اور مالی حیثیتوں میں تفاوت ہے۔ اب جہاں تک
امداد باہمی کے تالاب میں اعانتی رقوم جمع کرنے کا تعلق ہے، ہر
ایک اس متعین شرح سے (مثلاً ایک آنہ فی روپیہ) اپنی آمدنی کا
ایک طے شدہ حصہ پیشکش کرتا رہے گا جو ضابطہ میں باہمی قرارداد
سے طے ہو جائے۔ اب جہاں تک ضرورت کا تعلق ہے، فرض کیجئے

کہ سب سے زیادہ دینے والے کو اس کا موقع ہی پیش نہیں آتا تو وہ دیتا چلا جائیگا اور لے گا کچھ نہیں، لیکن دوسری طرف ایک کم دینے والا چونکہ اداره اگر ضابطہ مقررہ کے مطابق پہلے ہی مہینے چار ایسی ضروریات سے دوچار ہوتا ہے جس پر کسی رفیق ادارہ کی مدد ایک متعینہ رقم سے کی جانی چاہئے تو یقیناً اسے چاروں مرتبہ مدد ملے گی، اگرچہ اس نے اس کا دسواں حصہ بھی ادا نہ کیا ہو۔ اس قسم کی ضروریات میں بیماری، ناگہانی مقدمہ، مجبوری کا سفر، موت فوت، بے روزگاری وغیرہ امور شامل ہو سکتے ہیں۔

(۵) امداد باہمی کے ایسے اداروں کو حکومت غذا بہم پہنچائیگی، کیونکہ اس کا ادارۂ زکوٰۃ ہے ہی اس لئے کہ مشکلات میں اس کے ذریعے ضرورت مندوں کی دستگیری ہو، بے سہارا لوگوں کو سہارا بہم پہنچایا جائے، بے روزگاروں کو وظائف دیئے جائیں، اور بیماروں کے معالجہ کا انتظام ہو سکے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ہر وہ ادارہ جو اس طرح کے مقاصد کے لئے وجود میں آیا ہو حکومت کی توجہ کا زیادہ مستحق اور زکوٰۃ کی تقسیم کا بہترین ذریعہ ہو سکتا ہے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے

کہ کارخانہ دار یا زمیندار جو کچھ افراد کی محنتوں اور قوتوں کو اپنے لئے مخصوص کرتا ہے وہ قانونی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے اس کا ذمہ دار ہوتا ہے کہ اُن افراد کی مشکلات میں ان کا معاون و مونس ہو، پس امداد باہمی کے ایسے اداروں میں اس کی طرف سے بھی حصہ داری لازم ٹھہرتی ہے۔ پس ان اداروں کے فنڈ کی تعمیر میں اصل شرکاء اور متعلقہ کارخانہ دار یا زمیندار اور حکومت اگر علی الترتیب ۱:۱:۲ کے تناسب سے شریک ہوں تو فنڈ اتنی تقویت پا سکتے ہیں کہ مختلف قسم کی مستقل اور ناگہانی آفتوں میں ضرورتمندوں کے لئے پناہ فراہم کر سکیں۔

(۶) بالکل اسی امداد باہمی کے اصول پر بڑے کاروباری بھی اپنا نظم چلا سکتے ہیں۔ مثلاً بین الاقوامی تجارت میں حصہ لینے والے سوداگر اپنا ایک ایسا نظم قائم کر سکتے ہیں کہ اگر کسی کو خسارہ ہو جائے یا کسی کا مال کا جہاز تباہ ہو جائے تو اسے امداد باہمی کا فنڈ بوقتِ ضرورت مقررہ امداد بہم پہنچا دے —— بلالحاظ اس کے کہ اس نے فنڈ میں اب تک کتنی ادائی کی ہے۔ بخلاف اس کے جس تاجر کو نہ خسارہ ہو، نہ کسی دوسری تباہی کا سامنا اسے کرنا پڑے، اس کا کام یہ ہے

کہ وہ اپنی آمدنی کا مقررہ حصّہ برابر فنڈ میں ادا کرتا چلا جائے اور اسے یقیناً اس وقت تک کچھ نہ ملے گا جب تک وہ ضابطہ کے مطابق امداد کا حقدار نہ ہو جائے۔ اسی طرز پر ملک کے کارخانہ دار باہم مل کر ایک نظم قائم کر سکتے ہیں، کہ اگر ان کے کارخانے آتشزدگی کا لقمہ ہو جائیں تو ان کا فنڈ ان کی پشت پر موجود ہو۔ یہی صورت مشینوں۔ موٹر گاڑیوں اور دکانوں کے مالکوں کے درمیان ہو سکتی ہے۔ اور یہی صورت زمیندار اور کسان فصلوں کی تباہی کی زد سے بچنے کے لئے اختیار کر سکتے ہیں۔

(۷) اس طرح کے امداد باہمی کے جتنے فنڈ وجود میں آئیں اُن کا فوری ضرورت سے زائد سرمایہ اسلامی نظام میں اصولِ مضاربت پر صنعت و تجارت میں لگایا جا سکتا ہے ــــ بنکوں کے ذریعے بھی اور بلا واسطہ طور پر بھی! اس طرح فنڈ پھلتے پھولتے رہیں گے۔

(۸) یہ ناگزیر ہے کہ ایک جدید طرز کا یہ سسٹم جاری کرنے اور اسے کامیابی سے چلانے کے لئے ابتداءً حکومت اس کی ایک محدود سی نگرانی کی ذمہ داری قبول کرلے۔

آخر میں پھر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ تمام صورتیں صرف عبوری دور میں اختیار کی جاسکتی ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہئیے کہ گوارا کی جاسکتی ہیں، —— ورنہ درحقیقت اسلام روپیہ بچانے کی عادت کی جگہ انفاق کی عادت ڈالنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لئے وہ پبلک کی تمام ضروریات اور مجبوریوں میں ان کو مدد بہم پہنچانے کی ضمانت اپنی حکومت سے دلوا کر اور ہر فرد کو "فکرِ فردا" سے بے نیاز کر کے اس سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی ناگزیر ضروریات کو پورا کرنے کے بعد سوسائٹی کی اجتماعی بہبود میں حصّہ لے۔

زمیندار، مزارع اور اسلام

سوال: علّامہ مودودی کا رسالہ "ملکیّتِ زمین" نظر سے گذرا۔ پڑھ کر یہ معلوم ہُوا کہ اسلام کا اقتصادی نظام نہ صرف زمینداری کو جائز سمجھتا ہے[1] بلکہ ضروری سمجھتا ہے[2]۔ اور اسلامی نظام کی پوری مشینری بہ مع فوج د

---

[1] زمینداری بہ شکل موجودہ نہیں، بلکہ بصورتِ جائز۔

[2] زمینداری کو ضروری نہیں سمجھتا، بلکہ حقِ ملکیّت کو انسانیت کیلئے ضروری سمجھتا ہے۔

پولیس کے زمیندار کے اختیارات[۱] کی حفاظت کرے گی، اور یہ دیکھے گی کہ اس کی زمینداری صحیح و سالم[۲] ہے۔

بخلاف اس کے کاشتکاروں کے حقوق "محض اخلاق[۳]" کے بلند ہونے ہی پر پورے کئے جا سکتے ہیں۔ ہم نے مانا کہ اسلامی نظام میں زمیندار اور کسان کی باہمی رضامندی پر ہی معاملات طے ہوں گے، لیکن یہ کوئی نئی بات[۴] نہیں۔ موجودہ زمانہ میں بھی یہی ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کسان اس پوزیشن میں کب ہوتا ہے کہ وہ زمیندار سے اس کی مرضی کے خلاف احتجاج کرے اور کام نہ کرے۔

پھر زمیندار یہ کرتا ہے کہ وہ بھوکے اور خستہ حال کسانوں کو قرض دے کر احسان مند کرتا ہے اور اس طرح ناجائز فائدے اٹھاتا ہے

۱؎ مولانا مودودی نے یہ دعویٰ نہیں کیا، یہ الفاظ خود آپ نے اسلام کے سر ڈال دیئے ہیں، تحفظ صرف جائز ملکیت اور جائز حقوق کا ہو سکتا ہے، نہ کہ غیر محدود اختیارات کا۔ ۲؎ یہ محض ایک کھوکھلا طنز ہے۔ اسلامی حکومت زمیندار اور مزارع کے درمیان انصاف کو قائم کرنے کی ذمہ دار ہے اور وہ صرف یہ دیکھے گی کہ یہ انصاف صحیح و سالم ہے یا نہیں! ۳؎ یہ "محض اخلاق" کی بات پھر من گھڑت بات ہے۔ ۴؎ آپ "نئی بات" چاہتے ہیں یا اسلام کا فیصلہ!

مثلاً مقامی پالٹیکس میں دخل اندازی۔ اسمبلی کی نشست کے لئے ووٹوں کا حاصل کرنا وغیرہ۔ علاوہ بریں وہ پبلک فنڈز میں بڑے بڑے چندے دیکر حکومت میں دسترس پیدا کر لیتا ہے۔ بمقابل اس کے غریب لوگوں کے حقیر چندے کچھ بھی شمار نہیں ہو سکتے۔

آپ مجھے دنیا کا کوئی ایسا ملک دکھا دیجئے جہاں سرمایہ دار اور زمیندار موجود ہے اور اقتدار اس کے پاس نہیں ہے![1]

پھر یہ کہ ایک زمیندار گھر بیٹھا کسان کی محنت پر دن گذار سکتا ہے۔ صرف اس لئے کہ اس کا باپ جائداد چھوڑ گیا ہے اور اس طرح سے وہ ملک کی دولت میں اضافہ کئے بغیر دوسروں کی محنت کے بل پر بیٹھا کھاتا ہے۔ اس کی حیثیت بالکل حرام خور کی سی ہے۔ اسلامی ریاست کے لئے یہ کتنا دردناک عذاب ہوگا کہ وہاں ایک طبقہ بالکل بیکار بیٹھ کر عیش و عشرت کی زندگی گذار دے گا۔

---

[1] مگر براہ کرم پہلے آپ ہی کسی ایسے ملک کی نشاندہی فرما دیجئے جس میں اسلام بحیثیت نظام زندگی کارفرما ہو اور پھر ہم سے یہ سوال کیجئے گا۔ بہتر ہو کہ آپ یہی بتا دیں کہ کہیں کوئی ایسا ملک بھی ہے جہاں قومی ملکیت کارفرما ہو اور پھر وہاں انسانی آزادی کی کوئی رمق باقی رہ گئی ہو۔

قانون وراثت بھی اس معاملے میں ایک بیکار ہتھیار ہے۔ سیٹھ عبداللہ ہارون کا جب انتقال ہوا تو ان کی جائداد ان کے چار بیٹوں میں تقسیم ہوگئی۔ اب ان کے چار بیٹوں کی دولت بڑھتے بڑھتے ہر ایک کے پاس[1] اتنی ہوگئی جتنی کہ سیٹھ ہارون کے پاس تھی۔ کیا اثر ہوا ہماری اقتصادیات پر؟

میری رائے یہ ہے کہ مودودی صاحب نے پوری کتاب زمینداروں کے حقوق تسلیم کرانے کے لئے لکھی ہے۔ لیکن بچارے کسانوں نے کیا جرم کیا تھا کہ ان کے حصے میں پوری کتاب میں سے صرف آدھا صفحہ آیا، وہ بھی حد درجہ تشنہ۔ وقت کا تقاضا تو اس کے خلاف ہے:۔

جواب:۔

آپ کی ذہنی پریشانی کی اصل وجہ کی نشاندہی خود آپ کے

---

[1] سرمایہ داری کا رجحان اس کے برعکس ہوتا ہے کہ وہ چار سرمایہ داروں کو مدغم کر کے ایک بناتی ہے لیکن آپ نے جو مثال بیان کی ہے وہ ایک سرمایہ دار کے چار بنا دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ نتائج بالکل اس کے برعکس ہوں گے۔

خطے سے ہوتی ہے۔ آپ اسلام کے سامنے "وقت کا تقاضا" اور "زمانے کا ذہنی رجحان" لا کے رکھتے ہیں کہ وہ اس کی تصدیق کرے جب وہ ایسا نہیں کرتا تو آپ مضطرب ہو جاتے ہیں اور اضطراب قسم قسم کے سوالات کی شکل اختیار کرتا ہے۔

دراصل ہمارے گرد و پیش کی فضا پر کمیونسٹ فلسفہ اپنا پرتو اتنا گہرا ڈال چکا ہے کہ اس کے مخالفین تک میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو قومی ملکیت کے اصول سے ورے ورے کوئی حلِ مشکلات اختیار کرتے ہوئے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں تنگ نظر، پست فکر اور تاریک خیال سمجھا جائے گا، اور اس بات سے ڈرتے بھی ہیں کہ ہم پر سرمایہ داری کی حمایت و تائید کا الزام چپک دیا جائے گا۔ اس وجہ سے وہ کسانوں اور غریب طبقوں کو مظلومی سے نکالنے کے لئے صرف ایک ہی حل کو برحق قرار دیتے ہیں کہ سرمایہ و زمین اور ذرائع و وسائل کو افراد سے چھین کر ریاست کے حوالے کر دیا جائے۔ ان کا مطالبہ صرف یہ نہیں ہوتا کہ غریبوں کی مشکلات کا حل بتاؤ، بلکہ یہ ہوتا ہے کہ وہی حل

تنازعہ جس کا دنیا میں چرچا ہے اور جسے بہت سے لوگ مان چکے ہیں۔ پھر مطالبہ اتنا ہی نہیں ہوتا کہ اس حل کی حمایت کرو بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اسی کو اسلامی حل بھی قرار دو!

ہماری درخواست یہ ہے کہ آپ پہلے اس طرزِ فکر سے اپنے آپ کو الگ کر لیں، اور اپنے ذہن کو اس حقیقت پر جما دیں کہ وقت کے رجحانات اور تقاضے اور ہماری خواہشات اور جذبات ایک شے ہیں، اور اسلام ایک شے ہے۔ یہ دونوں ہر حال میں ایک نہیں ہوتے۔ پھر دوسری چیز یہ طے کر لیں کہ آپ وقت کے رجحانات اور اپنی خواہشات کو اسلام پر قربان کرنا صحیح سمجھتے ہیں یا اسلام کو ان کا تابع بنانا لازم جانتے ہیں۔ اب اگر یہ طے ہو جائے کہ آپ اسلام ہی کو معیارِ فیصلہ بنا کے چلیں گے تو پھر آپ دیکھیں گے کہ ساری گرہیں یکے بعد دیگرے کھل جائیں گی۔

مودودی صاحب کی خصوصیت جس نے انہیں ہماری تاریخ میں ایک امتیازی مقام پر لا کھڑا کیا ہے، یہی ہے کہ وہ اسلام کو معیارِ فیصلہ مان لینے کے بعد وقت کے رجحانات اور اپنی خواہشات سے

احکام اخذ نہیں کرتے، بلکہ کتاب وسنت سے انہیں جو کچھ حق معلوم ہوتا ہے، اسے پورے اعتماد اور زورِ استدلال کے ساتھ دنیا کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ اس خطرناک جرأت سے کام لیتے ہوئے ان کو نہ تو احساسِ کمتری لاحق ہوتا ہے، نہ انہیں ملّائیت اور تاریک خیالی کے الزامات سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ اور نہ بندگانِ ماحول کے طنز آمیز القابات کی پروا ہی وہ کرتے ہیں۔

پس اُن کی کتاب پر تنقید کرنے کے حق کو استعمال کرتے ہوئے آپ ایک مسلم کی طرح یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ انہوں نے کتاب وسنت کو استدلال کا مرکز بنایا ہے یا کسی اور چیز کو؟ اور پھر جو استدلال کیا ہے وہ صحیح ہے یا اس میں کوئی گڑبڑ کی ہے۔ پھر اگر آپ دیکھیں کہ انہوں نے اسلام ہی کے مآخذ سے استدلال کیا ہے اور استدلال میں کوئی اختلال نہیں ہے تو اسے قبول کریں، لیکن اگر آپ ایسا نہ پائیں تو مولانا مودودی تو کیا دنیا بھر کے علماء و مقدسین بھی اگر جمع ہو کے کسی غیر اسلامی دعوے کو سامنے لائیں تو اسے رَد کر دیں — اور خود کتاب وسنت سے صحیح استدلال کریں یا کسی دوسرے ماہر سے

استفادہ کریں۔ یہ ہے ایک مسلمان کا سا طرزِ فکر!

لیکن یہ کوئی درست طریقہ نہیں ہے کہ ایک شخص اسلام کے اصلی ماٰخذ سے صحیح استدلال کر کے کوئی حقیقت سامنے لائے، اور وہ حقیقت فی نفسہٖ ہمیں ناپسند ہو تو بجائے اس کے کہ اس اصل حقیقت کے خلاف اپنی رائے دیں، سارا الزام اسے پیش کرنے والے پر رکھیں۔ اسلام سے کسی کا دل مطمئن نہ ہو سکے تو وہ کیوں نہ ہمت کر کے خود اسی کو چھوڑ دے، اس کی ترجمانی کرنے والے سے اُلجھنا کیا فائدہ دیگا۔ اگر اسلام انفرادی ملکیت کا حق مانتا ہے، اگر وہ بالمعاوضہ کسی کی محنت خریدنے کی اجازت دیتا ہے تو جس کسی کو یہ چیزیں ناپسند ہوں اور جو ان کو حق کے خلاف پاتا ہو، اس کا اخلاقی فرض یہ ہے۔ کہ وہ مردِ کار بنے اور خود اُس فلسفہ و نظام کے خلاف علَم اٹھائے جو ان نظریات کو ساتھ لایا ہے لیکن اسلام سے غیر اسلام کی تصدیق و حمایت چاہنا اور اس کے لئے "جدید اسلام" کے بانیوں کا سا طریقِ فکر اختیار کرنا بہت ہی افسوسناک حرکت ہو گی۔

اس کھری کھری تمہید کے بعد سوال کے اہم اجزا کا جواب درج

ذیل ہے:-

(۱) کاشتکاروں کے حقوق کی ادائی کو "محض اخلاق" پر منحصر ٹھہرانے کا الزام مودودی صاحب کو دینا زیادتی ہے۔ اس مقصد کے لئے قانون کو بھی اور دوسرے ذرائع کو بھی کام میں لائے بغیر چارہ نہیں۔ مولانا مودودی مدظلہٗ نے حسبِ ذیل قانونی اقدامات کو بنیادی طور پر ضروری قرار دیا ہے۔

ا۔ علماء و ماہرینِ اراضیات و مالیات کا ایک مشترک کمیشن جاگیروں اور زمینداریوں کی چھان بین کرے اور تمام ناجائز ملکیتوں کو بلامعاوضہ ادا کئے سلب کر لے۔

ب۔ زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ کی تفریق کو قانوناً ختم کر دیا جائے تاکہ اس بیہودہ طبقاتی تقسیم کے مٹنے سے جملہ مسلمانوں کے حقوق مساوی ہو جائیں۔

ج۔ ایک ایسا زرعی قانون بنایا جائے جس کے ذریعے مالکانِ زمین اور غیر مالک کاشتکاروں کے باہمی تعلق کو صحیح منصفانہ بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ جس کی رو سے مزارعت ہو تو سیدھی طرح اسلام

کے اصولِ شراکت پر ہو، اور یہ طے ہو جائے کہ مزارعت[1] کی کونسی شکلیں جائز ہوں گی اور کونسی ناجائز! مالک[2] اور مزارع کے درمیان زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم کس کس نسبت سے حصّہ[3] تقسیم ہو سکتا ہے۔ نقد کرایہ ہو یا مزدوری پہ کاشت کرائی جائے تو اس میں بھی مالک اور مستاجر اور مالک اور مزدور کے درمیان حقوق و فرائض کا تعین ہو جانا چاہیئے۔ دفٹ نوٹ میں مولانا نے اشارۃً یہ ضرورت بھی ظاہر کی ہے کہ اصلاح احوال کے لئے اُجرت اور کرائے کی مقدار قانوناً مقرر کی جا سکتی ہے۔ یہ[4] بھی طے ہو جانا چاہیئے کہ مالکانِ زمین کاشتکاروں سے اپنے حصے یا لگان کے علاوہ کوئی مال یا غلّہ یا خدمات لینے کے مجاز نہ ہوں گے، ورنہ اس طرح کی حرکات جرم قابلِ دست اندازیٔ پولیس ہوں گی۔ بے[5] دخلی اور فسخِ معاملہ کے متعلق بھی قواعد مقرر ہونے چاہئیں کہ وہ کن کن صورتوں میں ہو سکتی ہیں اور کن کن صورتوں میں نہیں ہو سکتیں۔ نیز[6] زمین کو بیکار ڈال رکھنے پر بھی شریعت کے احکام اور اسپرٹ کے مطابق پابندیاں عاید ہونی چاہئیں: تاکہ مالکانِ زمین کا یہ میلان کم ہو سکے کہ وہ کاشتکاروں سے من مانی شرطیں تسلیم کرانے کی کوشش

کرتے ہیں۔ اور اگر کاشتکار نہیں مانتے تو اپنی زمین کو بیکار ڈال چھوڑنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ بہ نسبت اس کے کہ کسی بندۂ خدا کو اس پر کام کرنے کا موقع دیں۔

د۔ شریعت کے قانونِ میراث کو زرعی جائدادوں کے معاملے میں پوری قوت کے ساتھ نافذ کرنے کی کوشش کی جائے۔

ہ۔ زرعی پیداوار کا عشر اور زمینداروں کے مواشی کی زکوٰۃ باقاعدہ وصول ہو۔

جس شخص نے ان ساری قانونی تدابیر کو اختیار کرنا لازم ٹھہرایا ہے اس پر محض اخلاق کا وعظ کہنے کا طعنہ دینا بہرحال زیادتی ہے آپ کو چاہئے تھا کہ اس حصّے کو بغور پڑھتے اور اس کے نتائج و اثرات کا باقاعدہ اندازہ کرتے۔[1]

(۲) زمیندار اور کسان کی باہمی رضامندی پر معاملات کا انحصار آپ کو کھٹکتا ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ اسلام کا یہ اصول آج بھی

---

[1] شاید یہ حصّہ آپ کو اس لئے غیر اہم نظر آیا ہے کہ یہ بقول آپ کے صرف "آدھا صفحہ" (اور درحقیقت ۱/۲ ۳ صفحے) تھا۔

کارفرما ہے، اور اس کے نتائج سامنے ہیں لیکن آپ اس چیز کو نظر انداز کر گئے کہ اسلامی نظام حکومت میں اس اصول کے ساتھ اور بھی کچھ اصول ہوتے ہیں جو آج موجود نہیں ہے۔ اسلام مزارع کو یہ کہہ کر چھوڑ نہیں دیتا کہ جاؤ جیسے چاہو زمیندار سے معاملہ کرو، تم فارغ البال رہو یا مفلوک الحال، مجھے اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ اصول ہے موجودہ نظام کا!

اسلامی نظام کا ایک بنیادی اصول کفالتِ عامہ (Social Insurance) کا اصول ہے۔ اس اصول کی رُو سے ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ اگر کوئی شخص بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم ہو یا ان کو پورا کرنے سے کم آمدنی حاصل کر رہا ہو تو وہ اپنے بیت المال سے اس کی ضروریات کو پورا کرے۔ اور اسی اصول کے ایک تقاضے کے طور پر اسلام میں جو حقوقِ محنت مقرر کئے گئے ہیں ان کی بنیاد اس نظریئے پر ہے کہ جو جس سے محنت لے وہ اس کی ضروریات بھی پوری کرے۔ اب فرض کیجئے کہ ایک مزارع کا معاملہ انصاف کے ساتھ کسی زمیندار سے طے نہیں ہو پاتا اور وہ بیروزگاری

میں مبتلا رہتا ہے۔ اس دوران میں حکومت ضامن ہے کہ اسے اس کی ضروریات اُس وقت تک پوری کر کے دے۔ جب تک کہ وہ خود اپنی کوشش یا حکومت کی مدد سے حد کفالت تک کا ذریعۂ روزگار نہ پالے۔ دوسری طرف اگر ایک مزارع کو اس کی محنت کا معاوضہ اصولِ انصاف کے مطابق نہیں ملتا تو وہ اسلامی نظام عدالت کے سامنے اپنا استغاثہ لا سکتا ہے، اور وہ نظامِ عدالت "اصولِ کفالت" ہی کے ایک قانونی تقاضے کے تحت اس کی کم سے کم ضروریات کے بقدر معاوضۂ کار اسے دلا سکتی ہے۔ آخر آج بھی تو عدلیہ ایک عورت کو اس کا نان و نفقہ شوہر سے دلاتا ہے۔ بالکل اسی طرح ہر محنت کار اپنے اور اپنے کنبے کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لئے اپنا حق بذریعہ عدالت وصول کر سکتا ہے۔

یہ پشت پناہی کا نظام جو اسلامی ریاست میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے، اگر کہیں کارفرما ہو اور ایک محنت کار کے لئے صحت کا تعلیم کا اور انصاف حاصل کرنے کا مفت انتظام موجود ہو نیز اسے بے روزگاری یا محرومی کی حالت میں یہ بھروسہ ہو کہ روٹی، کپڑا اور

مکان بہر حال اسے فراہم کیا جائیگا تو آخر وہ زمیندار سے گِر کر معاملہ کریگا۔ کیوں؟ اسلامی ریاست کا اصولِ کفالت عامہ محنت کار کی قوت سودا بازی (Bargaining Power) کو موجودہ حالت کے مقابلے میں بہت زیادہ بڑھا دیگا۔

(۳) موجودہ نظام میں "چندوں" کا بنیادی فلسفہ ہی باطل ہے آج چندہ لینے والے لیتے ہوئے اور دینے والے دیتے ہوئے یہ احساس رکھتے ہیں کہ یہ روپیہ کچھ اغراض کے لئے لگایا جا رہا ہے چنانچہ دونوں طرف سے غیر شعوری طور پر ایک دور رس سودا ہوتا ہے۔ موجودہ ذہنیتوں کے ہوتے ہوئے اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔ آج رضائے الٰہی سرے سے انفاق کی محرک ہی نہیں ہے، بلکہ ہے تو شہرت پسندی اور جاہ طلبی ہی کی ایک محرک ہے۔ لیکن اسلامی نظام تو ایسے چندوں سے اپنے "فنڈز" کو ناپاک بنانے سے بچائے گا۔ جن کے ساتھ رضاء الٰہی کی تمنا کے بجائے کسی طرح کی سوداگرانہ ذہنیت کے موجود ہونے کا سراغ مل جائے۔

جہاں تک محض "چندوں" اور حکومت و ملت کی مالی خدمات

کے بل پر اسمبلی میں پہنچنے کا تعلق ہے، اس کے دروازے اسلامی نظام میں دوسری طرف سے بند ہو جائیں گے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ آپ کے پارلیمانی نظام میں انتخابات اصول "امیدواری" (Candidature) پر نہیں ہوں گے کہ سرمایہ دار آگے بڑھ کر اپنے آپ کو پیش کریں، اور پھر اسلامی انتخابات میں اخلاق و سیرت کے جن واضح بنیادی تقاضوں کو آئینی طور پر معیار کی حیثیت دی جائے گی، وہ خود سرمایہ دار کو اگلی صفوں سے اٹھا کر پچھلی صفوں میں منتقل کر دیں گے۔ ان بنیادی تبدیلیوں کے بعد محض روپے اور زمینداری کے بل پر اسمبلی کی رکنیت اور دوسرے عہدوں کا حصول ناممکن ہو جائے گا۔

باقی رہا یہ امر کہ ایک زمیندار یا کارخانہ دار جذبات صالحہ کے ساتھ اگر ریاست اور پبلک اور اپنے محنت کاروں کی مالی اعانت کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس کی خدمات کی ایک قدر پیدا ہوتی ہے تو اس کے خلاف وجہ شکایت کیا ہو سکتی ہے۔ ایک صاحب حیثیت آدمی کی مالی قوت کا یہی تو بہترین مصرف ہے۔ اگر وہ اس مصرف پر مال صرف کرتا ہے تو اسلامی معاشرہ میں اس کے حسن عمل کا اعتراف

ہونا ہی چاہئے۔

(۴) یہ اصول آخر آپ نے کس اسلام اور کس قرآن اور کس ذخیرۂ حدیث سے اخذ کیا ہے۔ کہ ایک شخص اپنی محنت کے نتائج کے علاوہ اور کچھ لینے کا حقدار نہیں ہے؟ کیا آپ تحفے، ہدیے، ہبہ، ضیافت، صدقہ، عطیہ وغیرہ سب کو اس اصول سے حرام قرار دے دینا چاہتے ہیں؟ اگر نہیں تو آخر ایک وراثت و توارث ہی کے خلاف اشتعال کیوں؟

بلاشبہ وراثت و توارث کا نظام معاشرہ کے مختلف افراد کے لئے مختلف قسم کے حالاتِ زندگی فراہم کرتا ہے۔ لیکن آخر ذرائع و رسائل کا تفاوت انسانی زندگی میں ایک ناگزیر حقیقت ہے خود پیدائشی طور پر افرادِ انسانی کی عضوی اور دماغی قوتیں اور صلاحیتیں، ان کا ماحول، ان کی خانگی تربیت کا نظام اور ان کی تعلیم، ان کی صحت وغیرہ سبھی میں فطری تفاوت موجود ہے اور اسی طرح کا تفاوت آغازِ کار کرتے ہوئے سرمایہ و وسائل میں بھی ہو سکتا ہے اور ہونا چاہئے۔ بنائے فساد یہ نہیں ہے، بنائے فساد غیر اسلامی ذہن

اور غیر اسلامی نظام ہوتا ہے جو اس تفاوت سے ناجائز فوائد حاصل کرنے کی راہیں کھولتا ہے اور افرادِ انسانی میں تعاونِ کار کے راستے بند کرتا ہے۔

(۵) یہ تصور کہ دوسرے کی محنت سے بالمعاوضہ استفادہ کرنا بھی حرام خوری ہے، کسی خدا ترس آدمی کے ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتا، جسے یہ یقین ہو کہ آج جو فتویٰ بھی وہ دے رہا ہے اس کے بارے میں کل اسے اپنے حاکم کے سامنے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ اس فتوے کی بنیاد کتاب و سنت کی فلاں فلاں تصریحات پر تھی اور میں نے باقاعدہ تحقیق کرنے کے بعد زبان کھولی تھی۔

اگر اس طرح کا کوئی اصول حق ہو سکتا ہے تو پھر کسی تانگے پر کرایہ دیکر بیٹھنا، کسی قلی سے سامان اٹھوانا، کسی مزدور کی بنائی ہوئی مصنوعات روپے سے خریدنا سب ناجائز ہو گا۔ اور اگر یہ سب جائز ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایک شخص اپنی زمین کی کاشت ہی کے کام میں کسی شخص کو ملازم یا شریک کار یا مزدور کی حیثیت سے کسی معاوضے پر استعمال نہ کر سکے۔

براہِ کرم "لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی" کی وہ تفسیر اپنے ذہن سے نکال کر سوچئے جو کمیونسٹ مفسرینِ کرام نے گھڑ کے پیش کی ہے۔ اس تفسیر کو ماننے کے بعد آپ کو دورِ وحشت کی طرف لوٹ کر اپنے لئے نائی دھوبی، ترکھان، جولاہا، موچی، لوہار، خاکروب وغیرہ سب کچھ خود ہی بننا ہوگا، اور ماں، باپ، بھائی بہن، دوست، عزیز کسی کی محنت میں سے کچھ پانے کا حق نہ رہے گا۔

ان مرعوب کن فلسفہ طرازیوں کا جب آپ باریک تجزیہ کریں گے تو ان کی مضحکہ خیزی آپ پر خود ہی کھل جائے گی۔

(۶) آپ کی تحریر سے اندازہ ہوا کہ آپ کو اسلامی قانونِ وراثت کے اُن امتیازی پہلوؤں سے تعارف نہیں ہے جن کا عمل سرمایہ دارانہ نظامِ وراثت کے بالکل متضاد دولت کو زیادہ سے زیادہ دور تک پھیلانے کا ہے۔

اسلامی قانونِ وراثت کی حسبِ ذیل خصوصیات کو آپ نگاہ میں رکھ کر پھر سارے مسئلے کو سوچئے:-

ا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں قانونِ وراثت ایک مرنے والے کا

وارث بالعموم ایک ہی کو بناتا ہے تاکہ سمٹا ہوا خزانہ بدستور سمٹا رہے، اور ایک سانپ کی جگہ دوسرا سانپ اس کا چارج لے لے۔ بخلاف اس کے اسلامی قانونِ وراثت ایک آدمی کی جمع کردہ دولت کو بہت سے چھوٹے بڑے ٹکڑوں میں بانٹ دیتا ہے تاکہ جمع شدہ مال پھر پھیل جائے۔

(ب) مستحقینِ وراثت کی اسلام نے تین صفیں قرار دی ہیں (۱) ذوی الفرائض (۲) عصبات (۳) ذوی الارحام۔ ان میں سے صرف پہلی صف میں ۱۲ رشتے شامل ہیں اور ان میں سے بھی ۸ ایسے ہیں کہ ان میں سے جو بھی زندہ ہو وہ بہرحال حصہ پاتا ہے

مثلاً ایک شخص مرتا ہے اور فرض کیجیے کہ اس کے ماں باپ زندہ ہیں، اس کی بیوی ہے، اس کے چھ بیٹے بیٹیاں ہیں تو اس کا ترکہ نو حصوں میں بٹے گا۔ نہ یہ کہ صرف بیٹوں کو ملے۔ پہلی صف میں مقررہ تناسب سے تقسیم ترکہ کرنے کے بعد جو حصہ بچ رہے۔ وہ عصبات میں تقسیم ہوتا ہے، نیز اگر ذوی الفرائض موجود نہ ہوں تو ترکہ عصبات میں بٹتا ہے، اور اس صف کے شرکا کی تعداد

بہت زیادہ ہے۔ یہ بھی نہ ہوں تو ذوی الارحام کی صف ترکہ پاتی ہے۔ پس اسلامی قانون وراثت کے تحت دولت کے پھیلاؤ کا عمل زیادہ وسیع ہوتا ہے۔

اوسطاً اگر آپ ہر ترکہ کے لئے ۸ مستحقین فرض کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک بڑی زمینداری یکدم آٹھ چھوٹی زمینداریوں میں بدل جائے گی۔

(ج) اسلامی قانونِ وراثت میں عورت[1] بہ حیثیت ماں، بیٹی، بیوی اور بہن کے بھی اور دادی، پوتی، پھوپھی، بھتیجی، بھانجی ہونے کی حیثیت سے بھی ترکے میں مرد کے ساتھ شریک ہے۔ عورتیں ایک خاندان

---

[1] یہ بھی واضح رہے کہ اگر مزارعت اور بٹائی کا قاعدہ اسلام میں نہ ہوتا اور ہر شخص کے لئے صرف خود کاشت رقبہ رکھنے کا حق تسلیم کیا جاتا تو عورتوں کے حقوقِ وراثت زمین کی حد تک کسی طرح بحال نہ ہو سکتے۔ خود قانونِ وراثت ہی یہ شہادت دیتا ہے کہ اسلام میں مزارعت اور بٹائی کے اصُول کا موجود ہونا ضروری ہے شریعتِ اسلام نے دور دور کے مصالح کو نگاہ میں رکھ کر احکام دیئے ہیں۔

سے دوسرے خاندان میں بیاہی جاتی ہیں تو اپنے ساتھ اپنے
وراثتی حصے کو بھی لے کے جاتی ہیں، اس طرح ایک گھر کی دولت
اور جائداد ایک ہی گھر میں نہیں رہتی، بلکہ ایک گھر سے دوسرے
گھر میں منتقل ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کے پھیلاؤ کی رفتار اور زیادہ
تیز ہو جاتی ہے۔

اب آپ سوچئے کہ کُجا یہ قانونِ وراثت اور کہاں سیٹھ ہارون
صاحب کی جائداد کی تقسیم کی غیر اسلامی مثال کہ سب کچھ چار بیٹوں
میں بٹ جاتے۔

اس وقت تو ہر زمینداری میں کتنے ہی زندہ حقداروں کے حقوق
وراثت شامل ہیں۔ اگر بروئے قانون ان کو محسوب کر کے حقداروں
کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا جاتے تو ایک ہی مرحلے میں زمینداریوں
کے دَس، دس، بیس بیس، چالیس چالیس ٹکڑے ہونگے۔ یہ جائز
طریقہ دولتانہ رپورٹ کے من گھڑت طریقے سے زیادہ موثر نتائج پیدا
کر سکتا ہے اور اس کے خلاف کوئی مسلمان دَم نہیں مار سکتا۔

۷۔ مولانا مودودی نے اپنی کتاب لکھتے ہوئے جو اصل محورِ کلام

پیشِ نظر رکھا ہے۔ وہ زمین کی ملکیّت اور مزارعت و بٹائی کا اختلافی مسئلہ ہے۔ جسے بہت سے حضرات چھیڑ کر قسم قسم کے غیر ذمہ دارانہ فتوے دے رہے ہیں۔ اس مسئلے پر مولانا نے اپنی تحقیق پیش کی ہے ضمناً انہوں نے یہ واضح کرنے کے لئے کہ زمین کی انفرادی ملکیّت کو بحال رکھتے ہوئے بھی مزارعین سے انصاف کیا جا سکتا ہے۔ ایک باب " اصلاح کے حدود اور طریقے" کے عنوان سے سپردِ قلم فرمایا ہے۔ اس باب سے آپ کو اسلامی نقطۂ نگاہ کے مطابق صحیح (Approach) کے لئے رہنمائی مل سکتی ہے۔ اسکیم بہر حال الگ بنے گی۔

تاہم اس مختصر باب میں مولانا مودودی نے پوری بات کہہ دی ہے، اگرچہ صفحات کی تعداد کم استعمال کی ہے۔ آپ حاصلِ کلام کو دیکھئے نہ کہ تعدادِ صفحات کو۔

اِن اشارات کو سامنے رکھ کر ایک مرتبہ پھر پوری کتاب کو پڑھئے اور اگر کوئی چیز کھٹکے تو براہِ کرم اس کی نشاندہی کیجئے اور کتاب و سنت کے دلائل لے کر یہ واضح کیجئے کہ مولانا نے فلاں جگہ

غلطی کی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ مولانا کو کسی سچائی کے قبول کرنے میں اور اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں کوئی عذر نہیں ہوگا۔

چند معاشیاتی تحقیقیں

ایک صاحب نے اپنے مفصل خط میں چند ایسی الجھنیں پیش کی ہیں جو نظامِ معاشی کی اصلاح میں فرد اور حکومت کی ذمہ داریوں میں فرق نہ کرنے اور احکامِ شریعت اور خلفاء راشدین کے طریقِ کار کو پوری تفصیل سے نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں ان غلط فہمیوں کے متعلق اندازہ یہ ہے کہ ان کا اثر کم و بیش ہمارے دینی طبقے اور ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے اکثر افراد میں پایا جاتا ہے۔ پس مختصر جواب پر اکتفا کرنے کے بجائے ضروری امور کی پوری طرح وضاحت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ا۔ کسی ملک میں جب پیمانۂ کبیر پر معاشی ناہمواریوں کو فروغ حاصل ہو چکا ہو اور زندگی کی ساری سہولتیں طبقۂ امرا نے اپنے

لئے سمیٹ لی ہوں تو متوسط طبقے اور غریب طبقے کے کروڑوں افراد کی معاشی گتھیوں کو سلجھانا کوئی آسان کام نہیں رہتا۔

بلاشبہ حساس اور خدا ترس افراد پر اپنے گردوپیش کی مفلوک الحال آبادی کے بارے میں بڑی بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، لیکن افراد محض اپنی انفرادی حیثیت سے ان مصائب کا خاتمہ کر ہی نہیں سکتے جن کو پیدا کرنے اور جن کو نشوونما دینے کی ذمہ داری نظام حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ چند افراد اگر انسانی اخوت و ہمدردی کے جذبہ سے انتہائی حد تک بھی سرشار ہو جائیں تو بھی وہ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتے ہیں وہ اتنا ہی تو ہے کہ وہ اپنا گھر بار لٹا کر خود کو انتہائی فلاکت زدہ طبقہ میں شامل کر دیں، اور ڈوبتوں کو سہارا دیتے ہوئے خود بھی ڈوبنے والوں میں شامل ہو جائیں، لیکن ایک بگڑے ہوئے معاشرہ میں چند آدمیوں کا اپنے آپ کو ہمہ تن لٹا دینا بھی معاشی ناہمواریوں کا خاتمہ نہیں کر سکتا۔ اصلاح کا اصل کام اُس اجتماعی قوت کا ہاتھ پکڑ کر اُسے عدل پر مجبور کر دینا ہے جو ہر بگاڑ کی اصل ذمہ دار ہوتی ہے۔

اصلاح پسند قوتوں کی اصل توجہ ایک نظامِ معاشی کے عنان برداروں پر منعطف ہوتی ہے - اور وہ دولت کے بٹوارے کے اُس مرکزی انتظام کو پوری اہمیّت کے ساتھ پیشِ نظر رکھتے ہیں جس کے تحت اربابِ اقتدار ایک ہاتھ سے اپنے شہریوں سے محاصل وصول کرتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے وہ جمع شدہ خزانے کو ان پر ایک خاص تناسب سے صرف کرتے ہیں۔ وصول و صرف کا یہ مرکزی نظام اگر نادرست ہو تو اگر کچھ بے نفس لوگ رضا کارانہ طور پر اپنی جائدادیں عوام میں لٹا ڈالیں تو اس سے ناہمواریوں کا خاتمہ نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ جب اشتراکی فکر اپنے ابتدائی دورِ ظہور میں تھی تو اس کے اصولوں پر ایمان لانے والے کچھ افراد نے فرانس میں یہ کوشش کی تھی کہ وہ نظامِ حکومت کو بدلے بغیر محض اپنے طور پر کارخانہ داری کو نئے اصولوں پر ڈھال لیں۔ اور مزدوروں کو ان کے تمام جائز حقوق بہم پہنچا دیں، لیکن یہ تجربات قوت و دولت کے صرفِ کثیر کے بعد ناکام ہو گئے۔ اور پھر اشتراکی تحریک نظامِ حکومت میں انقلاب لانے کے لئے پوری یکسوئی سے صف آرا

ہو گئی۔ بالکل اسی طرح اگر معاشرے کی قیادت اور حکومت کا نظام غیر اسلامی نہج پر چل رہا ہو تو کوئی فرد تنہا اس کے مفاسد کے آگے بند باندھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

دراصل فرد کے ذمے والدین، اہل وعیال، ذوی القربیٰ، یتٰمیٰ و مساکین، مسافروں اور قیدیوں اور پڑوسیوں کے بارے میں جو معاشی ذمہ داریاں عاید کی گئی ہیں، ان کا دائرہ اثر محدود ہے۔ اور وہ سب صحیح معنوں میں اگر نتیجہ خیز ہو سکتی ہیں تو صرف ایک اسلامی معاشرے ہی میں ہو سکتی ہیں۔ انفرادی انفاق تو اسلامی اسٹیٹ کے رفاہِ عام کے نظام کے ان رخنوں کو پُر کرنے کے لئے ہے جو بہرحال کسی نہ کسی پہلو سے چھوٹ جاتے ہیں۔ لیکن یہ انفرادی انفاق اسٹیٹ کی فرض ناشناسیوں کا ازالہ کرنے کے لئے کبھی کافی نہیں ہو سکتا۔

پس اصل جدوجہد نظامِ حکومت اور معاشرہ کے ماحول اور تقسیم دولت کے اصولوں کی اصلاح کے لئے صرف ہونی چاہئے۔ اور انفرادی انفاق کا بہت بڑا حصّہ اسی جدوجہد کو تقویت بہم پہنچانے کے لئے مخصوص ہونا چاہئے۔

۲- انسان کی طبعی ضروریات بنیادی طور پر بہت ہی محدود ہیں۔ اسے پیٹ بھرنے کو ساگ پات، کچّا غلہ یا آٹا اور پینے کو پانی مل جائے تو زندگی کی بنیادی ضروریات یہی ہیں۔ ان سے آگے بڑھیں تو وہ پتوں سے، کھالوں سے یا کسی کپڑے کے چیتھڑے سے بدن کے ضروری حصّوں کو ڈھانک سکتا ہے۔ اور آگے چلیں تو اس کی رہائش کے لئے کوئی غار، کوئی جھونپڑی، کوئی کٹیا فراہم ہونے کی ضرورت قابلِ تسلیم نظر آتی ہے۔

لیکن حیوان اور انسان میں فرق یہی ہے کہ اوّل الذکر صرف ضرورت کو پورا کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔ لیکن آخر الذکر کے اندر ذوقِ جمال بھی ہے، حسّیات لطیف بھی ہیں، اُس کے دیکھنے، سونگھنے، چکھنے اور لمس کرنے کی قوتیں بھلے اور برے کی تمیز کرنے میں بہت ہی زیادہ حسّاس ہیں۔ ان وجوہ سے وہ ضروریات کی حدود کو مسلسل وسیع کرتا چلا جارہا ہے اور ان ضروریات کو پورا کرنے کے طور طریقوں میں ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔

پس "ضرورت" کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی میں ایک دوسرا

پہلو بھی پایا جاتا ہے جسے قرآن "زینت" کا نام دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

یٰبنی اٰدم خذوا زینتکم عند کل مسجد وکلوا واشربوا ولا تسرفوا ط انہ لا یحب المسرفین ٥ (پ ع)	اے اولادِ آدم! تمام نمازوں میں (شرکت کرتے ہوئے) اپنی زیبائش کا اہتمام کر لیا کرو۔ اور تمہیں حق ہے کہ کھاؤ اور پیو، لیکن اسراف نہ کرو بلاشبہ وہ (اللہ) مسرفین کو نہیں چاہتا۔

پھر رہبانیت کے تصوّرات کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیّبٰت من الرزق ط قل ھی للذین اٰمنوا فی الحیٰوۃ الدنیا خالصۃً یوم القیمۃ ط کذالک نفصل الاٰیٰت لقوم یعلمون ٥ (پ ۸ ع ۱۱)	اے نبیؐ! ان سے کہئے کہ اللہ کی (جائز کردہ) دلچسپیوں اور غذا کی اُن پاکیزہ اقسام کو حرام کرنے والا کون ہے جو خود اللہ ہی نے اپنے بندوں کیلئے بہم پہنچائی ہیں؟ — کہہ دیجئے کہ اس دنیوی زندگی میں ایمان لانے والوں ہی کا جائز حق ان پر ہے۔ (اگرچہ کفار کو بھی استفادہ کرنے کی

ڈھیل دے دی گئی ہے) اور آخرۃ
میں تو یہ صرف انہی کے لئے مخصوص
ہونگی۔ یوں ہم کھول کھول کے اپنے
احکام کو واضح کرتے ہیں، اُن لوگوں
کے لئے جو سمجھتے بوجھتے ہیں۔

پھر واضح فرمایا کہ اصل میں حرام ہے کیا؟:۔

قل انما حرم ربی الفواحش ما ظهر منها وما بطن والاثم والبغی بغیر الحق وان تشرکوا بالله ما لم ینزل به سلطنا وان تقولوا علی الله ما لا تعلمون ۝ (پ ۸-ع ۱۱)

اے نبیؐ! اعلان کر دیجئے کہ میرے رب نے تو اگر حرام کیا ہے تو صرف بے حیائیوں کو، چاہے وُہ کھلی ہوں یا چھپی، اور نافرمانی کو، اور کسی کے اوپر کسی وجہِ جواز کے بغیر زیادتی کرنے کو اور پھر اس بات کو کہ اس کے ساتھ تم کسی کو شریک ٹھہراؤ جس کے بارے میں خود اللہ نے کوئی سند نہیں اتاری اور یا پھر اس بات کو کہ اللہ کے ذمے

وہ بات لگاؤ جس کے بارے میں
تم کوئی علم نہیں رکھتے۔

در اصل اس سارے سلسلۂ کلام کا محور اگرچہ دوسرا ہے، لیکن اس کے ذریعے غلط مذہبی روایات کے تحت پیدا ہونے والے ایک خطرناک رجحان کا سدباب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عام طور پر خدا پرستی جب بھی خدا کی ہدایت سے آزاد ہوتی ہے تو اس میں ترک دنیا اور بالخصوص ترکِ زینت کا رہبانی انداز پیدا ہوتا رہا ہے۔ یہ وہ خطرناک بلا ہے جو تمدن کی ترقی کے سامنے روک بن کے کھڑی ہو جاتی ہے، حالانکہ دینِ فطرت تمدنی ارتقاء کو روکنے کے لئے نہیں آیا، بلکہ اسے ایک صحیح راستے پر موڑ کر اس کی رفتار کو تیز سے تیز تر کرنے آیا ہے۔ اسلام کے ظہور سے قبل عرب کی مذہبی ذہنیت کو عین یہی روگ لگ چکا تھا، چنانچہ وہ لوگ جب بیت اللہ کا طواف کرتے تھے تو لباس سے آزاد ہو جایا کرتے تھے، کیونکہ لباس ان کو ایک پر تکلف سامانِ زینت محسوس ہوتا ہے جو خدا پرستی کے تقاضوں کو پورا کرنے میں حائل

ہوتا تھا۔ خدا کے حضور جاتے ہوئے وہ تمدن و تہذیب کے لوازم کی ساری کینچلیاں اتار کے جاتے تھے اور اس کے بغیر ان کے نزدیک معراج عبادت کا حصول ممکن ہی نہ تھا۔

لیکن جب ان کے سامنے تحریک اسلامی نمودار ہوئی اور اس کے کارکنوں نے ان رہبانی تصوّرات کی بیخ کنی کر دی اور نہ صرف طواف کے لئے بلکہ تمام عبادات میں زیادہ سے زیادہ خوشنما لباس کے ساتھ اپنے آپ کو خدا کے حضور میں پیش کرنا شروع کیا تو ان پر طنز کیا جاتا تھا۔ کہ واہ! یہ خوب خدا پرستی ہے کہ صفائی ستھرائی، سلیقہ، آرائش وغیرہ قسم کی ساری آلودگیاں ساتھ لگی ہوتی ہیں۔ اس قسم کی فضا میں ان آیات کا نزول ہوا اور ان سے غلط مذہبی تصورات کی بیخ کنی مطلوب تھی۔

اس سارے سلسلۂ کلام کا آغاز آدم وحوا کی داستان سے ہوتا ہے۔ جو اپنی فطرت کے تقاضوں سے مجبور ہوئے کہ اپنا بدن ڈھانپیں۔ اسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے لباس کے دو مقاصد بیان فرمائے ہیں:۔

یٰبنی اٰدم قد انزلنا علیکم لباسًا یواری سوءاتکم وریشًا ؕ	اے اولادِ آدم! ہم نے تمہارے لئے پوشاک فراہم کی تاکہ وہ تمہاری ستر پوشی بھی کرے اور تمہارے لئے آرائش و زینت کا سامان بھی ہو۔
(پ - ع)	

یہاں بہت خوبی سے واضح کر دیا گیا ہے۔ لباس کا ایک پہلو ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ اور اس میں دوسرا قابلِ لحاظ پہلو زینت و آرائش کا ہے، بلکہ کہنا یہ چاہیئے کہ انسانی فطرت کے تقاضوں کو مدِّ نظر رکھا جائے تو جائز حد تک زینت و آرائش خود ایک ضرورت ہے، اگرچہ بنیادی نہیں!

لباس ہی کی طرح کھانے میں بھی یہ دونوں پہلو بیک وقت پائے جاتے ہیں یعنی اس کا قوت بخش ہونا اور اُس کا خوش ذائقہ ہونا، اسی طرح رہن سہن کی تمام ضروریات کو پورا کرتے ہوئے انسان مجبور ہے کہ وہ ضرورت کے ساتھ ساتھ زینت کا اہتمام بھی کرے۔ ضرورتیں ہمیشہ یکساں ہیں، لیکن زینت کا پہلو ارتقا پذیر ہے زینت کا مفہوم بڑا وسیع ہے۔ روٹی کا گول ہونا، چارپائی کا

چوکور ہونا، سالن میں مسالوں کا شامل ہونا، لباس کی قطع و برید اور اس کی سلائی (Tailoring) مکان کی دیواروں کی سپیدی، نہانے میں صابن کا استعمال، بالوں اور کپڑوں میں خوشبو ڈالنا، وغیرہ سب زینت و تفریح کے تقاضے ہیں۔ اس طرح کے تقاضوں کو زندگی کے دائرے میں ہم اپنی ضروریات سے الگ نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا کرنا چاہیں تو یہ انسانی فطرت کے خلاف ایک اعلانِ جنگ ہوگا، اور اس جنگ میں ہم اول قدم پر ہی شکست کھا جائیں گے۔

اب جن حضرات کو زینت و تفریح کے جائز تقاضوں کی اہمیت کا اندازہ نہیں وہ جب ایک مسلمان کی زندگی کا نقشہ بناتے ہیں تو اسراف اور ضروریات۔ دونوں کے نہایت غلط تصورات ذہن میں لے کر سوچنا شروع کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک مجرد بنیادی ضروریات کو پورا کرنا حلال ہوتا ہے۔ اور اس سے آگے جو کچھ بھی ہے وہ اسراف کی تعریف میں داخل ہو کر حرام ہو جاتا ہے۔ ایسے حضرات جب انتہا پسندانہ تنقید کی نگاہ سے ناپ تول میں مشغول

ہوتے ہیں تو کسی قمیض کے ساتھ کالر کا لگانا، کسی کے بدن پر کوٹ کا موجود ہونا، کسی کے دستر خوان پر سالن کے ساتھ اچار کا پایا جانا، کسی کا چائے پینا یا پان کھا لینا انہیں مسلمانی کا نقیض معلوم ہوتا ہے اور وہ اگر دوسروں میں یہ چیزیں پاتے ہیں تو اُن کو مُسرف شمار کرتے ہیں، اور اگر خود اپنے آپ میں پاتے ہیں تو ان کے ضمیر پر احساسِ گناہ کا بوجھ پڑ جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ زینت، اور خوش ذوقی کے پہلوؤں کا انسانی زندگی میں جائز حد تک موجود ہونا اسلام کے خلاف نہیں ہے، بلکہ اسلام نے اس کا مطالبہ کیا ہے۔ مثلاً نبی صلعم نے اپنے ایک خوشحال صحابی کو پھٹے حالوں دیکھ کر اسے تاکید کی کہ اس کے رہن سہن سے اللہ کی دی ہوئی نعمت کا اظہار ہونا چاہیئے، پھر آپ نے لوگوں کو یہ درس دیا کہ وہ بالوں کو پریشان رکھنے کے بجائے اُن میں تیل ڈالیں اور کنگھا کریں[1]، پھر آپ نے لوگوں کو تعلیم دی کہ وہ

---

[1] اگرچہ دوسری طرف آپ نے دن رات میک اپ کے مشغلے میں مصروف رہنے سے بھی منع کیا ہے۔ کیونکہ یہ دوسری انتہا ہے۔

لباسوں اور بدنوں کو اُجلا رکھیں، بلکہ ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ خوشبو لگانے کا اہتمام کریں۔ وغیرہ!

ان امور کو سامنے رکھنے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسانی زندگی کو زینت و تفریح سے خالی کرنے کا مطالبہ محض خلافِ شریعت ہی نہیں، بلکہ درحقیقت یہ تحریف فی الدین ہے۔ وہ چیز جسے اللہ نے حرام نہیں ٹھہرایا، اسے حرام قرار دیتے ہوئے یا بدرجۂ آخر مکروہ ٹھہراتے ہوئے آدمی کو کچھ تو خوف کرنا چاہیئے یہ بات تو اسی تعریف میں آتی ہے کہ "وان تقولوا علی اللہ مالا تعلمون" بلکہ یہ "قل من حرم زینۃ اللہ" کے جواب میں ایک پُر جسارت چیلنج ہے کہ ہاں اسے ہم حرام کرتے ہیں۔

ترکِ زینت کو بہ حیثیت اصُول کے اگر اختیار کر لیا جائے اور مجرّد ضرورت پر اکتفا کرنا انسانیت کے لئے شرعاً واجب ٹھہرایا جائے تو ہمیں پھر اپنے دورِ وحشت کی طرف پلٹنا ہو گا اور تمدنی ترقی کے آگے روک بن کے کھڑے ہونا ہو گا۔ جو لوگ اس تجربہ کو کر دیکھنا چاہتے ہوں وہ کر دیکھیں، تمدّن کی گاڑی اُن کے روکے

تو کیا رُکے گی، وہ خود اس کے پہیّوں تلے پس جائیں گے!

۳۔ اُوپر کی سطور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر ہم اسراف کا مفہوم متعین کرنا چاہیں تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ زندگی میں زینت و تفریح کے پہلو کا موجود ہونا لازماً اسراف کی تعریف میں نہیں آتا۔

لفظ اسراف کی باقاعدہ تحقیق اور بہ حیثیت اصطلاح اس کی تفصیل کرنے کے لئے تو زیادہ فرصت کی ضرورت ہے یہاں تو صرف ہم اپنے حاصلِ مطالعہ کو عرض کئے دیتے ہیں۔

اسراف انتہائی معصیت کبیرہ ہے۔ کتاب و سنت کے مطالعہ سے اس کی جو مختلف صورتیں سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں:-

۱۔ جن تفریحات اور دلچسپیوں کو شریعت نے مخصوص احکام کے ذریعے حرام ٹھہرا دیا ہے اُن میں مال صرف کرنا قطعی طور پر اسراف ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص شراب نوشی، رقص و سرود جانداروں کی تصاویر اور مجسموں، مردانہ ریشمی لباس اور سونے کے مردانہ زیورات، سونے چاندی کے برتنوں، قسمت آزمائی کے

کھیلوں، اور تفریحاً کتوں وغیرہ کے پالنے پر دولت وغیرہ کا کوئی حصہ بھی صرف کرتا ہے تو یہ اسراف میں داخل ہے۔ یہ مصارف ایک شخص کو اخوان الشیاطین کی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں۔

ب۔ وہ تمام مصارف جن کا مقصود کسی جائز ضرورت کو پورا کرنے یا تحریک اسلامی، خدا کے دین اور انسانی معاشرہ کی خدمت انجام دینے اور اس طرح رضائے الٰہی کو حاصل کرنے کے بجائے محض نام و نمود حاصل کرنا یا اپنی امارت کا ڈھنڈورہ پیٹنا اور کبر کا مظاہرہ کرنا ہو، یقیناً داخلِ اسراف ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مال صرف کرنے کی وہ تمام شکلیں جو ظاہراً انفاق فی سبیل اللہ کی سی ہوتی ہیں لیکن جن کی رُوح ریاکاری کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی، وہ اسراف سے بھی زیادہ موجب گرفت ہونگی۔

خصوصاً زندگی کی دینی اور معاشرتی اور سیاسی تقریبات میں ٹھاٹھ باٹھ کا مظاہرہ کرنے کے لئے دولت کو آگ لگانا صرف اسراف ہی نہیں، بلکہ سوسائٹی میں تبلیغ اسراف کا ایک خطرناک ذریعہ ہے۔

ج - اوسط درجے کی ضروریات سے آگے بڑھ کر زندگی میں خواہ مخواہ کے تکلفات کو شامل کر کے اپنی آمدنی کی چادر سے پاؤں پھیلا کر مقروضیت کی حد تک جا پہنچنا بھی اسراف ہی کی تعریف میں آتا ہے۔

د - زینت و تفریح فی نفسہٖ اگرچہ جائز ہے، لیکن جائز تفریحات کا دائرہ بھی اگر اتنا زیادہ وسیع کر دیا جائے کہ ضروریات ثانوی اور اضافی حیثیت اختیار کر جائیں تو اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ صورت بھی اسراف ہی کہلائے گی۔ مثلاً شرعاً یہ جائز ہے۔ کہ کبھی آپ کے دسترخوان پر ایک کے بجائے دو کھانے آجائیں، لیکن اگر دس دس کھانے پکنے لگیں اور کام و دہن کی لذت ایک ایسا مقصود بن جائے جس کے لئے خاص طور پر گوناگوں اہتمام کئے جانے لگیں یا مثلاً خادم رکھنے کے جواز سے فائدہ اٹھاتے ہوتے نوکروں اور نوکرانیوں کے بڑے بھرتی کر لئے جائیں تو یہ صورت قانوناً چاہے جائز ہو، اخلاقاً یہ بھی اسراف ہی کی حیثیت رکھتی ہے۔

۲۔ کسی آدمی کا اپنی آمدنی کو اس طرح صرف کر دینا کہ اس میں سے صدقات واجبہ و نافلہ، اقربا اور پڑوسیوں کے حقوق، اقامتِ دین

کی جدوجہد اور نظامِ اسلامی کے استحکام کے مطالبات کی ادائی کے لئے کم و بیش کوئی گنجائش ہی نہ نکالی جا سکے تو ایسی زندگی از سرتاپا اسراف ہو گی چاہے اس میں تفریحات کا پہلو عیاشی کی حد تک بڑھا ہوا نہ ہو۔

اگر کسی شخص کی زندگی اسراف کی ان پانچوں صورتوں سے خالی ہو تو وہ ایک بہترین مسلمان ہو سکتا ہے --- اگرچہ اسے آپ چائے پیتے ہوئے یا پان کھاتے ہوئے یا کوئی اور تفریح کرتے ہوئے دیکھتے ہوں۔

۴ - اسراف کے تصور کی طرح بہت سے لوگوں کے ذہن میں انفاق کے احکام کے تقاضوں کے بارے میں بھی بہت ہی غلط تصوّر کارفرما ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کے معنی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دورِ وحشت کا انسان جن چند بنیادی ضروریات پر اکتفا کیا کرتا تھا، ایک مسلمان سچا مسلمان بننے کے لئے اس پر مجبور ہے کہ وہ بھی انہیں ضروریات تک اپنے مصارف کو محدود کر کے باقی سب کچھ راہِ خدا میں صرف کر دے۔ نیز جب تک انفاق فی سبیل اللہ کے لئے کوئی محلِ صرف موجود ہو، وہ کچھ پس انداز نہ کرے۔

اس معاملے میں بلاشبہ نبی صلعم نے اپنے عمل سے انفاق کا اتنا انتہائی

معیار دنیا کے سامنے رکھا ہے کہ اُس معیار تک اُس انسان کامل کے سوا شاید ہی کسی کی رسائی ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلعم کا انتہائی معیار انفاق ہر فرد کے لئے واجب نہیں ٹھہرایا گیا۔ بایں ہمہ نبی صلعم نے اچھے سے اچھے کھانے بھی کھائے ہیں اور بردِ یمانی تک کو زینتِ بدن بنایا ہے۔ درآنحالیکہ عرب کے ہر متنفس کو یہ سب کچھ حاصل نہیں تھا۔ اور آپ نے اونٹ اور خچر کو سواری کے لئے اپنے استعمال میں رکھا ہے جبکہ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ پوری عرب آبادی کی ضروریات پوری ہو رہی تھیں اور تحریک اسلامی کو مزید مالی اعانت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ علیٰ ہذا القیاس آپ خوشبویات استعمال فرماتے تھے۔ اگرچہ ملک کا ہر فرد اس کی استطاعت نہیں رکھتا تھا۔

پھر مکّہ کی ابتدائی مسلم سوسائٹی میں بعض اغنیا موجود تھے اور انہوں نے اگرچہ تحریک کی ضروریات اور مساکین اور مسافروں کی حاجات پوری کرنے کے لئے مال صرف کرنے کو اپنا شعار بنا لیا تھا، لیکن اس کے باوجود ان کے پاس اثاثے تھے۔ اور پس انداز کردہ اموال بھی تھے اور ان میں سے بعض کو یہ موقع بھی ملا کہ ہجرت کرتے ہوئے

اپنے اموال کو بھی مدینہ لے گئے۔ یہ اثاثے اور اندوختے ہی تو تھے جو اضطراری حالات (Emergency) میں کام آنے تھے، ورنہ اگر روز کی بچت "العفو" کو روز خرچ دینا لازم ہوتا تو نازک مواقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنی رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف سے اسلامی حکومت کو آخر بڑے بڑے چندے کہاں سے ملتے۔

بچتوں کی دو قسمیں ہیں، ایک بچت کرنا وہ ہوتا ہے جو کسی انسانی ضرورت کے لئے ہو۔ پھر بچت کرنا وہ ہوتا ہے جو محض مستقبل کی کسی ناگہانی ضرورت کیلئے ہو۔ بچت کی یہ دونوں صورتیں عام حالات میں جائز ہیں اور سوسائٹی کی معمولی ضروریات ہیں مناسب مالی امداد کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا سلسلہ جاری رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن جب نازک حالات پیدا ہو جائیں، یعنی جنگ، قحط یا عام مفلوک الحالی کا ایک وقتی طوفان اٹھ کھڑا ہو، جس کو فرو کرنے کے لئے حکومت اپنے سارے ذرائع و وسائل کو ناکافی پاتی ہو تو ایسے مواقع پر "العفو" کو صرف کر دینا لازم ہو جاتا ہے۔

پس یہ سمجھنا کہ کسی کے پاس "العفو" ہونا ہی نہیں چاہئے، ورنہ انفاق کی ذمہ داری پوری نہیں ہوسکتی، غلط ہے۔

علاوہ بریں یہ نظریہ بھی اوسط درجے کے انسانوں کے لئے کبھی قابل عمل نہیں ہوسکتا کہ جب تک ایک آدمی بھی غذا، لباس، مکان اور معالجے سے محروم ہو کوئی شخص ان ضروریات کو ایک متوسط معیار پر پورا کرنے میں حق بجانب نہیں ہے، بلکہ اسے سب کچھ لٹا دینا چاہیئے جب تک اہلِ حاجت موجود ہوں کوئی شخص پیٹ بھر کے کھانا نہ کھائے، مناسب لباس سے تن نہ ڈھانکے، اپنے رہنے کے لئے مکان نہ استعمال کرے، اپنی بیماری میں معالجہ کا انتظام نہ کرے، اپنے سفر کے لئے سواری سے کام نہ لے، اپنے اہل وعیال کی تعلیم پر مال صرف نہ کرے، بلکہ جو کچھ اسے میسّر ہو، صدقہ کرتا چلا جائے اس قسم کے نظریات آہستہ آہستہ لوگوں کو سرے سے اس بات ہی سے مایوس کر دیتے ہیں کہ وہ دین کے مطالبۂ انفاق کو پورا کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں لوگوں کو اگلے وقتوں کی کہانیاں معلوم ہوتی ہیں جن کو سن کر وہ جھوم تو سکتے ہیں، لیکن اُن پر عمل کرنے کا عزم لے کے

کبھی نہیں اُٹھ سکتے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ نبی صلعم نے اپنے صحابہ کو اسی واقع پر اس امر کی تعلیم دی ہے کہ خدا کی راہ میں انفاق کرو، لیکن اپنے اہل و عیال کے حقوق ادا کرنے کے لئے مناسب حد تک مال باقی بھی رکھو۔ آپؐ نے یہ بھی واضح طور پر فرمایا ہے کہ صدقہ اس طرح نہ کیا جائے کہ آدمی ایک ہی بار انفاق کرے اور پھر خود سائلوں اور محروموں کی صفوں میں شامل ہو کر سوسائٹی کے لئے بار بن جائے یہ حقیقت جس آیۂ قرآن سے اخذ ہوتی ہے وہ بھی آپ کے پیش نظر رہنی چاہئے:۔

ولا تجعل یدک مغلولۃ	اور اپنے دستِ انفاق کو نہ تو دل کے بخل
الیٰ عنقک ولا تبسطھا	کی، گردن کے ساتھ باندھ لے، اور نہ اس
کل البسط۔ (پ۱۵ ع۳)	کو یکسر کھول ہی دے۔

پس انفاق بھی اعتدال کے ساتھ مطلوب ہے اور اسلام کا منشا یہ ہے کہ آدمی اپنی گوناگوں ذمہ داریوں میں سے ہر ایک کا لحاظ کرے۔ نہ یہ کہ وہ ایک ہی طرف لڑھک جائے۔

۵۔مندرجہ بالا مسائل کے متعلق بعض غلط فہمیاں ایسی ہیں جو خلافت راشدہ کے احوال و آثار کے غلط مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ درحقیقت خلفائے راشدین کے بارے میں سوانح نگاروں نے بھی معاشی حقائق کے کچھ پہلوؤں کو انتہا پسندانہ طریق سے ابھار کے پیش کیا ہے کیونکہ یہ پہلو خاص طور پر سبق آموز تھے۔ لیکن ان حقائق کے بعض دوسرے پہلوؤں کی وضاحت کما حقہٗ نہیں ہو سکی۔ پھر ستم یہ ہوا کہ ہمارے خطیبوں اور واعظوں نے بھی پورے زورِ کلام کے ساتھ یک رُخی باتیں بیان کی ہیں۔ چنانچہ اب حال یہ ہے کہ خلفائے راشدین اس خاکی دنیا کے انسان نظر نہیں آتے۔ اور دورِ حاضر کا ایک متوسط آدمی اپنے اندر اس بات کی ہمت ہی نہیں پاتا کہ وہ ان مقدس ہستیوں کے بنائے ہوئے راہِ عمل پر گامزن ہو سکے۔ آج لوگ ان سے عقیدتیں وابستہ کرتے ہیں، لیکن ان کے سانچے میں ڈھلنے کو ناممکن خیال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ا۔ نبی کریم صلعم نے معاوضوں کے بارے میں جو ہدایت فرمائی

ہے وہ یہ ہے:۔

من كان لنا عاملاً فليكتسب
زوجة وان لم يكن له
مسكناً فليكتسب مسكنا
وان لم يكن له خادم
فليكتسب خادماً، من
اتخذ وراء ذالك
فهو غال او سارق

جو کوئی ہماری حکومت کا کارکن ہو
تو وہ بیوی فراہم کر سکتا ہے، اور
اگر اس کے پاس مکان نہ ہو۔ تو
مکان حاصل کر سکتا ہے اور اگر
اس کے پاس خادم نہ ہو تو وہ خادم
بھی رکھ سکتا ہے، لیکن اس سے
زیادہ جس کسی نے خزانۂ حکومت
سے کچھ لیا وہ خائن ہے یا چور!

یہ روٹی کپڑے کے علاوہ وہ ضروریات ہیں جن کا صرفہ اسلامی حکومت کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اوسط درجے کے ایک معقول معاوضے کے اصول ہیں اور ان اصولوں پر جو معاوضہ دیا جا رہا ہو، اس میں صاف ستھری گذر ہو سکتی ہے۔ ان اصولوں سے یہ نہیں ٹپکتا کہ ملک کے انتہائی غریب آدمی کے برابر یا تمدنی تقاضوں کا لحاظ کئے بغیر صرف بنیادی ضروریات کے مطابق انتہائی کم معاوضہ لیا جائے

کیونکہ نبی صلعم اپنے ملازمین حکومت کو خادم بھی فراہم کرتے ہیں۔

اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۱۰۰[1] روپے سے کچھ کم ماہانہ معاوضہ لیا تھا ـــــ حالانکہ عرب کے بے شمار بدوؤں کی ماہانہ آمدنی اس سے کم اور معیارِ زندگی اس سے پست تھا اور ان میں وہ بھی تھے جن کی بنیادی ضروریات بھی خوش اسلوبی سے پوری نہ ہوتی تھیں۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے آپ کو "مال یتیم" کے والی کی حیثیت دیتے ہوئے انتہائی محتاط طریقے سے جو معاوضہ صحابہؓ کے مشورے سے طے کیا، وہ یہ تھا:۔

۱۔ سرکاری مصارف پر ایک سواری کا انتظام۔

---

[1] یہ خلیفۂ اول کے تقویٰ کی انتہا تھی۔ کہ آپ نے مرتے وقت وہ ساری رقم بیت المال میں داخل کرنے کی وصیت کی جو آپ نے بطورِ معاوضہ وصول کی تھی۔ لیکن آپ کا یہ ایثار اس کی دلیل نہیں ہے۔ کہ بیت المال سے کارکنانِ حکومت کے لئے کچھ لینا ناجائز ہے۔

ب۔ سردی گرمی کے لئے دو جوڑے کپڑوں کے۔

ج۔ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات کے لئے قبیلۂ قریش کے متوسط آدمیوں کے برابر معاش (جس کا اندازہ دو درہم یا ۱۰ار، ۱۲ار یومیہ قرار پاتا ہے)

یہ ظاہر ہے کہ قبیلۂ قریش عام عرب کے مقابلے میں مالدار اور خوش حال تھا اور اس کا معیارِ زندگی نسبتہً بہتر تھا۔ پھر اس قبیلے میں سے بھی آپ نے نہ تو چوٹی کے امراء کے معیار کو سامنے رکھا۔ اور نہ دوسری طرف بالکل نیچے کے غرباء کے معیار کو، بلکہ متوسط طبقے کے معیار کو اپنے لئے پسند کیا۔

یہ حقیقت بجائے خود قابلِ لحاظ ہے کہ اس دور میں عربی آبادی کا مجموعی معیارِ زندگی اتنا پست تھا کہ اس کا کوئی تصور آج ہم کر ہی نہیں سکتے، یہاں تک کہ قریش کے خوشحال ترین قبیلے کا متوسط طبقہ بھی آج کے غریب طبقے سے بہتر نہ تھا۔

تاہم خلفائے راشدین کے اسوہ سے جو قابلِ اتباع روایات سامنے آتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سرکاری کارکنوں کی بنیادی

ضروریات کو پورا کرنے کے لئے جو معاوضے دیئے جائیں۔ وہ ہر دور کے اوسط درجے کے معیارِ زندگی کے مطابق ہونے چاہئیں یہ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت حالات ایسے ہوں کہ اسلامی تحریک یا اسلامی حکومت کے کارکنوں کو اپنی خدمات بالکل بلا معاوضہ پیشکش کرنی پڑیں اور اپنی ضروریات کے لئے الگ سے محنت کرنی پڑے لیکن اس قسم کے حالات عارضی ہوتے ہیں۔ اور بیت المال میں جوں جوں فراخی آئے گی، کارکنانِ اسلام کو ضروری حد تک معقول معاوضے ملنے لگیں گے۔ چنانچہ تاریخ سے اس امر کی شہادت ملتی ہے۔ کہ اسلامی ریاست کے مالی حالات جتنے جتنے بہتر ہوتے گئے، کارکنوں کے معاوضوں میں مسلسل اضافے ہوتے گئے۔

ب ا۔ خلفائے راشدین کے دور میں چونکہ مستقبل کے لئے روایات قائم ہو رہی تھیں۔ اور عملی نظائر (Precedents) وجود میں آ رہے تھے۔ اس لئے بیت المال میں تصرف کرنے میں انتہائی احتیاط برتی گئی۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اہل بیت نے جب سرکاری وظیفہ میں سے ایک اچھا کھانا

پکانے کے لئے بچت کر دکھائی تو آپ نے اس بچت کے بقدر اپنے معاوضے میں کمی کر دی۔ دوسری طرف حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہد کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ بیت المال میں شہد موجود ہے تو وہ از خود اس میں تصرّف نہیں کرتے بلکہ اپنے رفقاء سے مشورہ لیتے اور اجازت طلب کرتے ہیں۔

یہ احتیاطیں اس مقصد کے لئے تھیں کہ بیت المال کے امانت ہونے کا تصور مستحکم ہو جائے اور اس میں آزادانہ تصرف سے لوگ باز رہیں۔ بیت المال سے استفادہ کرنے کا کوئی ضابطہ ہو اور ذمہ دارانہ پن کے گہرے احساس سے کام لیا جائے۔

پس اب خلفاء راشدین نے نبی صلعم کی ہدایات کی روشنی میں بیت المال میں تصرف کرنے اور معاوضہ بندی کرنے کے بارے میں جو اصولی اسوہ قائم کر دیا ہے۔ اس کا اہتمام تو ہر دور میں کیا جائے گا۔ لیکن اگر بیت المال کے معاوضے اور اسلامی حکومت کی تنخواہ کے بارے میں انتہائی حساسیت سے کام لیا جائے۔ اور معروف کے مطابق اوسط درجے کو استعمال کرتے ہوئے بھی آدمی کا ضمیر بار محسوس کرنے لگے۔ تو

اس کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہ ہوگا۔ کہ سرکاری بیت المال سے تنخواہ لے کر کام کرنے پر کوئی متقی انسان تیار ہی نہ ہو سکے گا۔ خود دورِ فاروقی میں یہی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ بعض صحابہ نے اسلامی حکومت کی بالمعاوضہ خدمت سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن حضرت عمر رضؓ نے انہیں مجبور کیا۔ کہ وہ معاوضہ لے کر کام کریں۔ چاہے وہ غنی ہی کیوں نہ ہوں۔

ج۔ یہ بلاشبہ صحیح ہے کہ اسلامی حکومت میں امیر مملکت (Head of the State) کی ذمہ داری تمام کارکنانِ حکومت کے مقابلے میں ممتاز قسم کی ہے۔ وہ اپنے معاوضے کے بارے میں تو اشد احتیاط برتے گا۔ لیکن عام کارکنانِ حکومت کے لئے سہولت کی گذر کا اہتمام کرنا اس کے لئے واجب ہے۔ تاکہ ان کی کارکردگی (Efficiency) کا معیار بلند رہ سکے۔ نیز بددیانتی (Corruption) کے لئے کوئی معاشی وجوہ پیدا نہ ہونے پائیں۔ یہی مسلک خلفاءِ راشدین کا تھا انہوں نے خود تو کم سے کم حد تک معاوضے لئے ہیں۔ لیکن اپنے نائبوں، ججوں، سپاہیوں میں جائز حد تک نہایت معقول معاوضے اور وظائف تقسیم کئے ہیں۔

دراصل بیت المال کو "مالِ یتیم" کی حیثیت دے کر اپنے آپ کو متولی محسوس کرنا صرف امیر مملکت کا کام ہے۔ رہے اس کے دوسرے ماتحت کارکن اور عام ملازم سو وہ براہِ راست مالِ یتیم کے متولی نہیں ہوتے، بلکہ ان کی حیثیت ویسی ہوتی ہے جیسی ان کارکنوں کی ہوتی ہے جنہیں کسی یتیم کا متولی یتیم کی جائداد کو سنبھالنے اور اس کو نفع بخش بنانے کے لئے ملازم رکھتا ہے۔ ان ملازمین کو وہ ان کی صلاحیتوں اور خدمات کے مطابق درجہ بدرجہ معیارِ مروّج کو پیش نظر رکھ کر معاوضہ دے گا۔

د۔ کسی نازک صورت حالات (Emergency) کے پیدا ہو جانے کی صورت میں امیر مملکت کی ذمہ داریاں انتہائی طور پر نازک ہو جاتی ہیں۔ مثلاً اگر جنگ، وبا یا قحط وغیرہ کی وجہ سے عوام مصائب میں مبتلا ہو جائیں اور مصائب کے ازالہ کے لئے ملک کی ساری قوت کو ایک طرف متوجہ کرنا پڑے تو امارت کا سکون تہ و بالا ہو جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وقت کا حکمران رعایا کی تمام مشکلات کے بارے میں براہِ راست خدا اور خلق دونوں کے سامنے جواب دِہ ہے۔

ایسے خاص حالات میں چونکہ حکومت کے ذرائع و وسائل کی کوتاہی

کو پورا کرنے کے لئے شہریوں سے پورا تعاون حاصل کئے بغیر کام نہیں چل سکتا، لہٰذا امیرِ مملکت مجبور ہوتا ہے کہ وہ بچت اور ایثار کی عام اپیل کرے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ مسرفین کی زبان سے بچت کی اور مترفین کی زبان سے ایثار کی اپیلیں سن کر دنیا نے کبھی اثر نہیں لیا۔ اور قول و فعل کا تصادم عوام میں کبھی صالح جذبات کو نہیں ابھار سکتا، اس وجہ سے ایک اسلامی مملکت کا سربراہ کار دوسروں سے اپیل کرنے سے پہلے اپنے عمل کو دوسروں کے لئے نمونہ بناتا ہے[1]۔ یہی صورت تھی جب کہ

---

[1] آج حال یہ ہے کہ امرائے مملکت قومی ضروریات کے لئے بچت کی اپیلیں کرتے ہوئے اپنی کئی کئی ہزار روپوں کی تنخواہوں میں سے قوم کے لئے کچھ بھی پس انداز نہیں کرتے۔ یہ غریبوں سے چندے طلب کرنے نکلتے ہیں۔ لیکن اپنی جیب سے اپنی استطاعت کے مطابق کبھی کسی فنڈ کے لئے چندہ نکال لینے کا موقع انہیں کم ہی پیش آتا ہے۔ یہ قحط میں کم غذا پر اکتفا کرنے کا وعظ کہنے گھر سے نکلیں گے تو توس مکھن کھا کے نکلیں گے۔ یہ اگر دوسروں کو ملک کے نازک حالات کا واسطہ دلا کر اتحاد کی تلقین کریں گے تو خود آپس میں عہدوں کے لئے کش مکش کو اور زیادہ تیز تر کر دیں گے۔ یہاں پر عمل کا وعظ بے عملی کی زبان سے کہا جاتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قحط چھا جانے پر گیہوں کی روٹی، گوشت روغن زیتون اور گھی کھانا چھوڑ دیا تھا۔ اور اس وقت تک عوام کے ساتھ مل کر فاقہ کشی کی۔ جب تک پورے ملک کو مناسب غذا فراہم نہ ہونے لگی۔ بعض لوگوں نے خاص حالات کے اس طرزِ عمل کو ہر قسم کے حالات کے لئے لازم سمجھ لیا ہے، حالانکہ تاریخ اس کی گواہی نہیں دیتی۔ اس قسم کے حالات جب کبھی آ جائیں تو ان کے تقاضوں کے مطابق حکومت کے سربراہ کا عمل کو عوام کے مصائب میں شریک ہونا ہوتا ہے، لیکن عام حالات میں یہ کوئی اصول نہیں کہ امیر مملکت یا کارکنانِ حکومت کی زندگی ہر لحاظ سے اس معیار پر رہے جس پر مملکت کے غریب ترین افراد کی زندگیاں ہوں۔

س۔ تنخواہوں اور معاوضوں کے بارے میں اصول اگرچہ ہر دَور میں ایک ہی رہیں گے، مگر ہر تمدنی دور اور ہر ملک کے معیار زندگی کے لحاظ سے ان اصولوں کی عملی تفسیر میں ایک گونہ فرق ہو گا۔ مثلاً خلیفہ دوم اپنے دَور کے متوسط طبقے کے معیار کو پیش نظر رکھتے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسی دَور کے قریش کے اوسط آدمی کے معیار کو آج کے دَور میں بھی

پیش نظر رکھا جائے۔ بلکہ آج تو آج ہی کے متوسط درجے کو پیش نظر رکھا جائیگا ——— حالانکہ آج کے دور کا اوسط معیار تیرہ سو سال پہلے کے قبیلہ قریش کے اعلیٰ معیار سے لگا کھاتا ہے، بلکہ بعض پہلوؤں سے تو یہ بڑھا چڑھا ہے۔ پھر فرض کیجئے کہ اگر آج برٹش اور امریکن قومیں اسلام کو اپنا نظام حیات بنالیں تو ان کے کارکنان حکومت کے معاوضے ان کے اپنے تہذیب و تمدن کے لحاظ سے معیار اوسط کے مطابق ہوں گے، نہ یہ کہ آپ ان سے مطالبہ کریں کہ اپنے آپ کو قبیلۂ قریش کے سوا ہزار سال قبل کے معیار پر لاؤ۔ آج کون روغن زیتون کے چراغ جلائے گا؟ آج کون کھجور کی گٹھلیوں سے بنے ہوئے ستو کھائے گا، آج کون اونٹ کے بالوں کے خیمے لگا کے رہے گا اور آج کون کھجور کے پتوں کے چپل پہنے گا؟ ———

آج آپ اپنی سوسائٹی کے ایک ادنیٰ ترین فرد کے گھر جا کے اس کے برتنوں اور سامانوں کی فہرست بنائیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ نیا تمدن کتنے نئے لوازم در آمد کر چکا ہے۔ ان لوازم کو ختم کرنا اگر ممکن ہے تو صرف رہبانیت سے ممکن ہے۔ لیکن رہبانیت کبھی ایک نظام حکومت کو چلانے کے قابل نہیں ہوتی۔

تمدن معاوضوں کے معیار پر بہت گہرا اثر ڈالتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے سواری کے لئے اونٹ طلب کیا تھا۔ لیکن آج اگر حضرت عمرؓ ہی کو اسلامی حکومت کی ذمہ داری سنبھالنی ہو تو وہ موٹر کار اور ہوائی جہاز کے بغیر ایک بڑی سلطنت نہ چلا سکیں گے۔ اسی طرح حضرت سیّدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کوئی دفتر نہیں تھا۔ لیکن آج اگر وہ زندہ ہوں اور پاکستان کے امیر مملکت بنائے جائیں تو ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ وہ پورے لوازم کے ساتھ ایک دفتر آراستہ کرائیں اور ان کے ساتھ ایک وسیع سیکرٹری ایٹ بر سر عمل ہو۔[1]

---

[1] تمدنی ارتقار کا لحاظ کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کارکنانِ حکومت کو عیاشی کے سامان فراہم کرنے کی ذمہ داری بھی حکومت کے بیت المال پر عائد ہوتی ہے نہ تمدنی ارتقار کی آڑ لے کر معاوضوں کو اس مسرفانہ حد تک بڑھایا جا سکتا ہے کہ ایک آدمی اپنے لئے ہی نہیں، اپنی اولاد کے لئے بھی خزانہ ہائے گراں بہا سمیٹ لے اور جائدادیں بنائے۔ آج اکابرِ حکومت کے لئے جس طرح کے معاوضے اور الاؤنس رائج ہیں وہ جائز حدود سے بہت آگے نکل چکے ہیں اور ان کی وجہ سے لاکھوں کارکنانِ حکومت اور ملک کے کروڑوں شہریوں کو سخت (اگلے صفحہ پر)

۶۔ آپ کے سارے سوالات کا اصل محور کتے پالنے اور ان کے اکھاڑے منعقد کرنے کے جواز و عدم جواز کا مسئلہ ہے۔ آپ کی تحریر سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ یا تو کتوں کو پالنے اور ان کو دودھ گھی، حلوا پوری کھلانے اور ان کے دوڑوں کے مقابلوں وغیرہ کو جائز قرار دیا جائے۔ ورنہ پھر کوئی تفریح اور کوئی سامانِ زینت جائز شمار نہیں ہونا چاہیئے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اونٹ، گھوڑے، بھینس، بکری اور بلّی پالنے کے مقابلے میں کتے پالنے کا معاملہ بالکل جداگانہ قسم کا ہے۔ اول الذکر میں سے کچھ کے متعلق قرآن میں یہ وارد ہے کہ "لتركبوها وزينة" یعنی تم ان پر سواری کرو اور وہ تمہارے لئے سامانِ زینت ہوں۔ پھر کچھ کے متعلق ایک طرف فرمایا کہ:۔

جعل لكم من جلود الانعام بيوتًا — اللہ نے چوپایوں کی کھالوں سے تمہارے لئے خیمے فراہم کئے۔

پھر فرمایا کہ:۔

بقیہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہ سب کچھ اصلاح طلب ہی نہیں انقلاب طلب ہے!

ومن اصوافها واوبارها
واشعارها اثاثاً ومتاعاً
الی حین -

اور ان کی اُون سے، اور ان کی پشم سے، اور ان کے بالوں سے تمہارے لئے استعمالی اسباب فراہم کئے ہیں۔

پھر فرمایا کہ:-

ومن الانعام حمولۃ و
فرشاً -

اور چوپایوں میں سے بعض لدو ہیں اور بعض مذبح میں پچھاڑے جانیوالے ہیں۔

اس طرح کے مختلف فوائد کا تذکرہ کرنے کے ساتھ ساتھ دوسری طرف "زینت" کے پہلو پر توجہ دلائی کہ:-

ولکم فیها جمال حین
تریحون وحین تسرحون

اور تمہارے لئے ان کا منظر خوش آئند ہوتا ہے اس وقت بھی جب تم انہیں چرانے کے بعد، لوٹا کے گھر لاتے ہو اور اس وقت بھی جب انہیں گھروں سے لے کے نکلتے ہو۔

یہ "افادیت" اور "جمال" جس کا تذکرہ قرآن نے کیا ہے۔ اسے کسی ایک موقع پر بھی کتوں سے نسبت نہیں دی، بلکہ کتوں کے پالنے کو

شریعتِ اسلامی نے ناپسند (Discourage) کیا ہے۔
حدیث میں تصریح سے وارد ہے کہ ایسے گھر میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے جس گھر میں (بلا کسی اشد ضرورت کے) کتے پالے گئے ہوں۔ اس کے وجوہ بھی واضح ہیں۔ ایک مسلمان جس کا گھر سوشل روابط کا مرکز ہونا چاہیئے، اس میں لوگوں کا بے کھٹکے آنا جانا ممکن نہیں رہتا دوسرے یہ کہ کتے پالنے والوں گھروں میں برتنوں اور لباس کی طہارت کو اسلامی معیار پر قائم رکھنا نسبتہً زیادہ مشکل ہو جاتا ہے اور اکل وشرب میں کراہت اور عبادات میں خلل پیدا ہونے کے وجوہ موجود رہتے ہیں۔

اس وعید کے ساتھ ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی تمدن کی حقیقی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دو حالتوں میں کتے پالنے کی رخصت دی ہے۔ ایک اس لئے کہ گھر کی حفاظت کے لئے یہ انتظام کرنا ناگزیر ہو، دوسرے کسی کی گذر بسر کا دارومدار جن ذرائع پر ہو۔ شکار بھی ان میں سے ایک ہو۔ علی ہذا القیاس سراغ رسانی یا عضویاتی اور نفسیاتی تحقیق وغیرہ ضروریات کے لئے ایک حکومت کتوں کے لئے خاص پرورش گاہیں بھی کھول سکتی ہے۔

ان رخصتوں کے علاوہ عام حالات میں کتے پالنے کا معاملہ ویسا نہیں ہے جیسے گھوڑے اور گائے بکری پالنے کا معاملہ ہے۔ پھر اگر ضرورۃً کتوں کو پالنے کی رخصت سے کسی کو فائدہ اٹھانے کی ضرورت پیش ہی آئے تو یہ "مشغلۂ لطیف" اس انتہا تک بھی نہ جا پہنچنا چاہیئے کہ کتے کو انسانی ذوق کے اونچے تقاضوں کے مطابق ایسی غذائیں کھلائی جائیں۔ ان کے لئے وہ ریشمی بستر فراہم کئے جائیں۔ اور ان کیلئے ملازم رکھنے پر اتنا صرف کیا جائے جتنا کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ، بیوی بچوں اور ذوی القربا اور احباب اور پڑوسیوں کے لئے بھی نہیں کرتا۔ کتا پالئے تو کتے کو کتے کی طرح پالئے۔ لے پالک نہ بنا لیجئے۔

پھر کتے پالنے کو ایک ضرورت کے طور پر نہیں، بلکہ مشغلے (Hobby) کے طور پر اختیار کرنا اور اس مشغلے کو فروغ دینے اور اس سے دلچسپی بڑھانے کے لئے کتوں کے میلے اور جلسے اور انعامی مقابلے منعقد کرنا ایک اسلامی معاشرہ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اس قسم کے اکھاڑوں پر ہزاروں روپیہ لٹا دینا لہو ولعب کی ایک مکروہ صورت ہے۔ خصوصاً اس طرح کی سرگرمیوں کی سرپرستی اگر ایک ایسی حکومت اور اس کے ذمہ دار افسر کرنے لگیں جو اپنے

سلمنے اسلامی نظام کو استوار کرنے اور اسلامی ماحول تعمیر کرنے کا گراں بہا نصب العین رکھ چکے ہوں، بہت ہی حوصلہ فرسا حرکت ہے - یہ نصب العین تو اتنا بھاری اور اتنا وسیع ہے کہ اس سے وقت اور مال بچانے کا موقع ایک دیانت دار حکومت کو مل ہی نہیں سکتا۔

یہ ہے وہ بات جسے ہم کہتے ہیں۔ لیکن اس پر اگر کوئی یہ کہے کہ یا تو کتوں کے میلوں اور مقابلوں کو ایک جائز تفریح مانو ورنہ زندگی میں تفریح کا کوئی پہلو بھی باقی نہ رہنے دو، تو اس کے استدلال کا کوئی جواب دینا مشکل ہو گا۔

توقع ہے کہ آپ اگر ترتیب وار اوپر کے سارے اشارات پر متوازن دماغ کے ساتھ پوری طرح غور و فکر فرمائیں گے تو آپ کے ذہن کی بہت سی گرہیں کھل جائیں گی۔

اسلامی نظام میں کفالتِ عامّہ

سوال:- "ترجمان القرآن" بابت شوال ۱۳۶۸ھ کے مندرجات سے چند سوالات پیدا ہوئے ہیں جو درج ذیل ہیں۔ تصریحات فرما کر ممنون فرمائیں:-

(۱) اپنی کمائی اور وراثت میں تقسیم دولت کی مساوات خلافِ اسلام ہے۔ یہ تسلیم۔ لیکن کیا کفالتِ عامہ کے سرکاری وظائف میں مساوات ضروری نہیں؟

"زیادہ سے زیادہ مدّت جو مساواتِ عامہ پیدا کرنے کے لئے درکار ہے وہ دس سال سے زائد ہو گی"

یہاں "مساواتِ عامہ" سے کیا مراد ہے؟ کیا مساوات عامہ اسلام کا منتہائے نظر ہے؟ حکمِ قرآنی یا ارشادِ نبوی یا ارشادِ صحابہ سے استنباط فرمایا جائے۔

جواب - (۱) کفالتِ عامہ کے اصول کے تحت اسلامی ریاست کو جو شخصی امدادیں نقدی یا سامانِ ضروریہ کی شکل میں دینی پڑیں گی وہ برابر نہیں ہو سکتیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ فرض کیجیئے کہ ایک خاندان کا کوئی ذریعۂ آمدنی سرے سے نہیں ہے، لیکن دوسرے خاندان کو ضروریات

سے کم آمدنی ہو رہی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اول الذکر کو ریاست کا بیت المال زیادہ وظیفہ دے گا اور مؤخر الذکر کو صرف اتنی رقم دی جائے گی جس سے اس کی کمی پوری ہو جائے۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ ایسا بھی ہو گا کہ ایک شخص محتاج اعانت ہے اور اس کے سر پر چھ افراد کی کفالت کا بار ہے، دوسرا درخواست دیتا ہے اور اس پر پندرہ آدمیوں کی کفالت کی ذمہ داری عائد ہے، ان دونوں کو بیت المال برابر سرابر کے وظائف نہیں دے گا۔ پھر یوں بھی ہو گا کہ ایک خاندان کو ریاست سال بھر تک ایک خاص ماہانہ وظیفہ دیتی ہے، لیکن کسی دوسرے خاندان کو صرف دو ماہ تک ہی ایسی اعانت کی ضرورت پڑتی ہے، اس کے بعد اس کے لئے ذریعۂ معاش نکل آتا ہے۔ انہی وجوہ کے پیش نظر میں نے اپنے مضمون میں جو بجٹ دیا ہے وہ مختلف قسم کے کنبوں کے لئے مختلف مقدار کی رقوم وظائف کو مشتمل ہے۔

"مساوات عامہ" کی نو ایجاد اصطلاح سے مراد جو اجتماعی حالت ہے وہ یہ ہے کہ:۔

ا۔ لوگوں کے لئے زندگی بسر کرنے کے لوازمات بہرحال عام ہو جائیں اور ان میں محرومی باقی نہ رہے،

ب۔ معاشی جدوجہد کے مواقع میں برابری پیدا ہو جائے اور

ایک طبقے کے لوگ ایسے بے بس نہ ہوں کہ دوسروں کی غلامی میں معاشی زندگی بسر کریں،

ج۔ معاشی عدمِ مساوات جس حد تک تقاضائے فطرت ہے اس سے بڑھنے نہ پائے تاکہ اخلاقی مساوات بحال رہ سکے۔

یہاں مدعا یہ نہیں کہ فرد فرد ہر لحاظ سے برابر سرابر ہو کہ نقدی، وسائل، مکان، زمین، سامان کی جتنی مقدار ایک کے پاس ہو اتنی ہی دوسرے کے پاس بھی ہو، بلکہ مراد یہ ہے کہ سوسائٹی کی عام فضا اتنی اصلاح پذیر ہو جائے کہ جائز فطری حدود سے بڑھی ہوئی ناہمواریاں نہ ہوں اور ضروریاتِ زندگی کے حصول میں پوری پبلک برابر کے حقوق پالے "مساواتِ عامّہ" کی یہ اصطلاح مفرد تصوّر پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ یہ اس حالت کا نام ہے جس کے پیدا کرنے کے لئے ایک طرف یہ حکم ہے کہ ریاست کی آمدنیاں کہیں طبقۂ امراء ہی میں گردش نہ کرتی رہیں اور کہیں یہ حکم ہے کہ اسلامی ریاست فقراء، مساکین، اور دوسرے ضرورت مندوں پر صرف کرے وغیرہ۔

محمد صدیق کاتب لاہور

انشاء پریس لاہور میں چھپی